The Drinched Book

فہرست مضامینِ "ہمایوں" بابت ماہِ جنوری ۱۹۴۱ء

جلد (۳۹)
نمبر (۱)

سالگرہ نمبر ۱۹۴۱ء

تصاویر:- (۱) امن اور جنگ (سہ رنگی) (۲) صبحِ نو (۳) تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (۴) دہقان شہزادی

سرورق:- یہ ایڈمنڈ ڈولاک کی ایک تصویر ہے۔ مصور نے اپنے تخیل میں ایک نئے ہادی کی آمد کا مشاہدہ کیا ہے جو اتحاد و امن کا پیغام سنا کر دنیا کو جنگ و فساد کی آلائشوں سے پاک کر دے گا وہ غالباً یہ بات بھی واضح کرے گا کہ انسانی مصائب کے اسباب بیرونی نہیں اندرونی ہیں یعنی ہماری حرص و ہوس ہماری نادانیاں اور ہماری خود غرضیاں

قیمت فی پرچہ بارہ آنے

کلامِ ہمایوںؔ

جنگِ عالمگیر نے دُنیا کی کایا دی پلٹ
مہر و مہ کہتے ہیں یہ دَورِ زمانہ اَور ہے

نوجواں اقوام کی چتون بدل جائے نہ کیوں
زالِ دُنیا کی ادائے دلبرانہ اَور ہے

ڈھونڈتا ہے ہر طرف راہِ ترقی اُن کا تیر
جنگ جُو قوموں کا اب طرزِ نشانہ اَور ہے

ہے یہ کُشت و خون یورپ! تیرے عصیاں کی سزا
یا سمندِ ناز پر اِک تازیانہ اَور ہے

اے ہمایوںؔ چشمِ ظاہر بیں سے تُو اِس کو نہ دیکھ
جنگِ عالم میں نہاں کوئی بہانہ اَور ہے

(کشمیر۔ اگست ۱۹۱۷ء)

قولِ اصغر

زندگی جو کچھ بھی ہے جد و جہد سے ہے۔ جد و جہد ہی ہے جو ہمارے اعمال میں کوئی معنی پیدا کرتی ہے لیکن جد و جہد کس چیز کے لئے؛ یہ ہے اصلی سوال! اگر ہم محسوس کریں کہ ہم کسی منتہا کے لئے کوشش کر رہے ہیں — میری مُراد ہے صرف وہ منتہا کہ واقعی کوشش کے قابل ہے ایک ایسی دُنیا میں جہاں موجودہ نصب العین گئے گزرے نصب العینوں کے سائے سے دوچار ہوتے ہیں جو اُن کی ہنسی اُڑاتے ہیں — اگر ہم یہ محسوس کرنے لگیں تو پھر فی الحقیقت ہماری ہمت بندھ جائے اور ہمارے دل اُمید سے لبریز ہو جائیں کیونکہ اس حال میں گو ہم اُس منتہا کو نہ پا سکیں اُس کے لئے جد و جہد ہی بذاتِ خود ہمارا منتہائے کمال بن جائے.... لیکن ہماری زندگیاں تو محض تلاش کے لئے وقف ہیں "تلاش، تسلی نہ دے سکنے والی تلاش! ہم ہمیشہ جد و جہد کرتے رہتے ہیں اور سعیِ پیہم اور جستجو کسی شے کی جو کسی طرح بھی ہماری فوری حاجت کو پُورا کر دے۔ یہ ہے ہماری پستی کا نشان کیونکہ وہ شے جس کے پیچھے ہم دوڑتے ہیں زندگی کے کسی منتہا کسی حقیقی منتہا سے کچھ بھی واسطہ نہیں رکھتی: بے تحاشا سی بھاگ دوڑ کسی نہ کسی شے کے لئے ایک حواس باختہ دُنیا میں! ڈھونڈو کوشش کرو جد و جہد کرو، یہ ہے اصولِ عمل، لیکن کیوں ایسا کرو یہ کسی کو معلوم نہیں، یہ کوئی نہیں پُوچھتا اور پُوچھے کیونکر جب پُوچھتے پُوچھتے وہ اس دوڑ میں سب سے پیچھے رہ جائے؛!

انگلستان۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۹ء: بہن کی طرف خط (ترجمہ از ب ا)

اصغر بشیر

"بزمِ ہمایوں"

اُردو ۱۹۴۰ء میں

"میرا یہ دعوےٰ ہے کہ وہ زبان یعنی اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے مٹائی نہیں جا سکتی"۔ یہ ہے سر تیج بہادر سپرو کا تازہ بیان جو ایک نئی کتاب "اُردو کے ہندو ادیب" میں شائع ہوا ہے۔ آگے چل کر وہ فرماتے ہیں کہ "اگر وہ لوگ جن کو اُردو سے دلچسپی ہے اور جو اُردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں اپنی کوشش میں کوتاہی نہ کریں گے تو باوجود اُن حملوں کے جو عملی طور پر اس زبان پر اس وقت ہو رہے ہیں اس کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں گے بلکہ اس کی توسیع بھی کر سکیں گے"۔ اسی سلسلے میں پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے ہندو تہذیب و تمدن اور ادب کو سو فی صدی فائدہ پہنچا۔ اسی ملاپ کا نتیجہ اُردو زبان اور اُردو ادب ہے۔ اگر اُردو مٹی تو ہندو اور مسلمان دونوں کا جینا اکارت ہے"۔ "اُردو کا خاتمہ کر کے ہم ہندو تمدن کے اُس حصے کا بھی خاتمہ کر دیں گے جس کے نشو و نما میں نناوے فی صدی ہندوؤں نے حصہ لیا ہے"۔ "ہم ہندوؤں کا تو اُردو پر مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ حق ہے اور اب ہمیں اس پر فاتحانہ قبضہ کرنا چاہیے"۔ "میری امیدیں بڑھ جاتی ہیں کہ ہندی کے طلبہ اور ادیب بھی اب اُردو کو اپنانے لگے ہیں"۔ "ہندو بہت جلد ہندوستان بھر میں اُردو کو اپنا کر رہیں گے"۔ مسٹر سپرو اپنے بیان کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "ہمیں یہ بات بھول نہ جانا چاہیے کہ اُردو کا یہ مسئلہ محض زبان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر درحقیقت تہذیب کا مسئلہ ہے"۔ اور اس تہذیب کے متعلق وضاحت کرتے ہیں کہ "وہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب ہے جو مغلوں کے وقت میں پیدا ہوئی"۔

اس مشترکہ تہذیب کی بنیادیں فی الحقیقت مغلوں سے صدیوں پہلے ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہو چکی تھیں۔ مغلوں نے آکر اُن پر شاندار عمارت بنائی جسے ہندوستانی تہذیب کہا جاتا ہے۔ ایرانی اور آریا دراصل ایک ہی نسل سے تھے۔ اِسی لئے فارسی اور سنسکرت لسانی طور پر ایک دوسری سے بہت ملتی جلتی ہیں اُن کے سینکڑوں لفظ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ پھر اہلِ عرب اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر رہنے والوں کے قدیمی تجارتی تعلقات کی وجہ سے اور بالخصوص محمد بن قاسم کے ۷۱۲ء میں سندھ کو فتح کر لینے کے بعد عربی زبان کا اثر یہاں کی زبانوں پر پڑا لیکن مشترکہ زبان کی اصلی بنیاد گیارھویں صدی عیسوی میں پنجاب میں رکھی گئی۔ گزشتہ سال (۱۹۴۰ء) میں تین دلچسپ کتابیں اُردو زبان کی تاریخ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ "نظمِ اُردو"، "ہندو ادیب" اور "تاریخ ادبِ اُردو"[1]۔ یہ تینوں اس بات پر متفق ہیں کہ اُردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی۔ ڈاکٹر گریم بیلی کی بھی یہی رائے ہے۔ "تاریخ ادبِ اُردو" کی تحقیق کے مطابق "واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان کا آغاز لاہور میں ہوا نہ کہ دہلی میں اور یہ کہ اس کی اساسی بنیاد قدیم پنجابی تھی نہ کہ کھڑی بولی"۔ اس کا پہلا درجہ وہ ہے جو ۱۰۲۷ء میں شروع ہوا اور جس کو لاہوری اُردو کا دور کہنا چاہیے۔ اسی دور میں زبانِ اُردو پرانی پنجابی اور فارسی کے ملاپ سے بنی تھی"۔ ناظر صاحب لکھتے ہیں کہ "میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ اُردو زبان کا جوا سب سے پہلے ہندوستان میں ہندوؤں ہی نے اپنے کاندھے پر رکھا کیونکہ جب ۱۰۲۷ء میں محمود نے پنجاب کو اپنی مملکتِ محروسہ میں شامل کیا تو لاہور کی ہندو رعایا نے اپنی کھڑی اور پنجابی (زبان لا ابتدائی) کی جگہ اس جدید زبان کو سر آنکھوں پر رکھا"۔ ناطق صاحب لکھتے ہیں "پنجاب کو جس طرح اُردو زبان میں سبقت حاصل ہے اسی طرح یہ صوبہ شعر و شاعری میں بھی سب پر مقدم ہے۔ ہندوستان کا سب سے پہلا اُردو شاعر مسعود بن سعد بن سلمان (۱۰۵۴ء تا ۱۱۳۱ء) تھا جس کی سکونت و پیدائش کا مقام لاہور تھا"۔ "سلطان محمود کے عہدِ سلطنت سے تا پونے دو سو سال تک پنجاب اُردو کا تنہا مربی رہا۔ اس مدت میں اُردو کو پنجاب نے

[1] نظمِ اُردو مصنفہ سید ابو العلا حکیم ناطق لکھنوی۔ "ہندو ادیب" مصنفہ ناظر کاکوروی۔ "تاریخ ادبِ اُردو" مرتبہ ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن۔

اتنا مضبوط کر دیا تھا کہ ضائع نہ ہو سکی، البتہ دہلی میں آکر ترقیوں کی منزلیں طے کرنے لگی"۔ پنڈت برجموہن صاحب کیفی امیر خسرو کو اُردو کا پہلا شاعر سمجھتے ہیں شاید اس لئے کہ وہی سب سے پہلے اُردو شاعر ہیں جن کا کلام ہم تک پہنچا ہے بہر حال چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں اُنہوں نے جس زبان میں اپنے اشعار لکھے وہ پنجابی الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔

ترا بگفستم میں تجھ کہیا ۔۔۔۔ کجا بماندی تو کت رہیا

سترھویں صدی کے شروع میں جب دکنی زبان میں محمد قلی قطب شاہ وغیرہ نے اپنے اشعار لکھے اُس میں بھی جا بجا پنجابی کے الفاظ پائے جاتے ہیں مثلاً ہور (اور) مٹھی (میٹھی) نے (سے) ڈے (دیکھ) دوانے (دیوانے) کچھ (کچھ) باج (بغیر):

پیا باج پیالہ پیا جائے نا ۔۔۔۔ پیا باج یکتل جیا جائے نا

قطب شاہ نہ دے مجھ دوانے کو پند ۔۔۔۔ دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

اُردو کی ترقی میں سب سے حصہ دار ہونے کے متعلق مصنف مذکور لکھتے ہیں کہ "اگر انصاف کریں تو پنجابی اپنی اس فیض رسانی پر قناعت کریں کہ وہیں سے اُردو نکلی، دلی اور آگرہ والوں کو اس بات پر خوش ہونا چاہیئے کہ اگرچہ سرزمین لکھنؤ کی قسمت میں یہ نعمت تھی مگر زیادہ تر انہیں کی لائی ہوئی تھی۔ دکن کے لئے یہ مسرت کم نہیں کہ اُس نے ریا کو سمندر بنا دیا"۔ پس ثابت ہوا کہ پنجاب کا اُردو سے گہرا اور پرانا تعلق ہے۔ اس لئے پنجابی اپنی بھولی بسری "فیض رسانی" پر "قناعت" نہیں کر سکتے۔ یہ بچی جو پنجاب میں پیدا ہوئی تھی دُور دُور چل پھر کر اور طرح طرح کے ملبوسات و زیورات سے آراستہ ہو کر اپنے میکے میں واپس آئی ہے۔ اب پنجابی اُسے اپنی محبت و خدمت سے نہال و دل شاد کریں گے جب جا کر قناعت کا دم بھریں گے۔

یہاں اُردو کی تاریخ اور عہد بہ عہد کی ترقیوں کا حال لکھنا مقصود نہیں۔ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ مختصر یہ کہ یہ ملی جُلی زبان پنجاب سے دہلی، دہلی سے دولت آباد، دولت آباد سے گجرات اور بیجاپور اور حیدرآباد اور اِدھر اُدھر بہار اور بنگال اور کٹک تک جا پہنچی مسلمانوں نے اِسے اپنے مذہب کی تبلیغ اور ہندوؤں نے اسے اپنے دھرم کے پرچار کے لئے استعمال کیا اور فائدہ اُٹھایا۔ اس زبان نے کئی نام پائے ہندی، ہندوی، زبانِ ہندوستان، ہندوستانی، ریختہ، ریختی، اُردو۔ اِسے ہندی کہتے لیکن یہ ہندی آج کل کی جدید ہندی سے بہت مختلف تھی۔ مولانا باقر آگاہ متوفی ۱۲۲۰ھ کا شعر ہے: ؎ ولے بعض یاروں کا ایما ہوا۔ سو ہندی زباں یہ رسالہ ہوا + اگر جدید ہندی والے بھی اس فقرے اور بعض اور یار اور ایما اور اس زبان اور رسالے کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت دیں تو پھر سارا جھگڑا ہی طے ہو جائے پھر وہ خوشی سے ہندوستان کی مشترکہ زبان کو ہندوستانی چھوڑ ہندی کہا کریں ہمیں مطلق اعتراض نہ ہوگا۔ اصلیت پر سمجھوتا ہو جائے نام بلا سے کچھ ہو لیکن افسوس کہ وہاں مقصد کچھ اور ہے اور اس لئے طور طریقے بھی عجیب و غریب ہیں۔ اُس وقت کی ہندی تو یہ تھی: ؎

کوئی پھیرے مالا کوئی پھیرے تسبی	دیکھو رے لوگو دو لوں کسبی	(کبیر) سن وفات ۱۳۹۸ء
جو مینا میں نہ کہے بیٹھی شکر کھائے	جو بکری میں میں کرے سہج ہی ماری جائے	(تلسی داس) ″ ″ ۱۵۲۴ء
سانس ماس سب جیو تمہارا ... تو ہے کھرا پیارا	نانک شاعر تو کہت ہے ..... سچے پروردگارا	(نانک) ″ ″ ۱۵۳۹ء
کتا ہوں تجھے پند کی ایک بات	کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات	
سلامت نہیں جس کے رے ہات ہیں	پڑھا جائے کہا جز لکبیر ہات میں	(وجہی) ″ ″ ۱۶۴۰ء

یہی وہ ہندی تھی جو ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہوئی اُردو کی شکل میں نمودار ہوئی۔ کہاں یہ زبان اور کہاں آج کل کی راشٹر بھاشا جس میں تقریر کو شبد، ونتی آبدے ہوا کو جل وایو، عقل کو بدھی، مطلب کو پریوجن، آسانی کو سرلتا، اخبار کو سماچار پتر، داخلے کے فارم کو گھسیٹر پتر، ملکہ سمندر کو سمدر، مٹی کو ماٹی، دیس کو دیش، دکھن کو دکھشن، بُرا کو دُشٹ کہنے پر اصرار ہے جیسا کہ راجہ رام شیو پرشاد "بھاشا کے اتہاس" میں لکھتے ہیں "شدھ ہندی کے طرفدار فارسی کے آنے سے پہلے جو پراکرت شبد جاری تھے ان پر بھی سنتوش نہ کرکے ویدوں کا زمانہ لانا چاہتے ہیں"۔ اعتراض اس پر نہیں کہ جدید ہندی ایسے لفظ کیوں استعمال کرتی ہے وہ خوشی سے کرم کو گنتر لو پر کھ سنکھیا اور آزادی کو سوتنترتا کہہ سکتی ہے مگر تکلیف کا باعث یہ امر ہے کہ وہ ملکی زبان کا دعوے کرکے پھر ایسے الفاظ رائج کرنے پر مُصر ہے جو ہندستان کی اکثریت سمجھنے سے عاجز ہے جس کے بعض خاص رہنماؤں کی بات بات میں "سلاست" کا چال ہے کہ "پڑھا جائے کیا جُز لکیر بات میں" اصد حیف کہ ہندوستان کی قسمت میں ایسی اُلٹی سیدھی لکیریں ہوں!

بعض دفعہ کہا جاتا ہے کہ ہندی دیہات کی زبان ہے یہ بالکل غلط ہے۔ **دیہاتی زبانیں** عموماً اُردو ہندی دونوں سے کچھ نہ کچھ علیحدہ ہیں ورنہ ہندی تھوا ہندوستانی تو اُسے چھو بھی نہیں گئی۔ شمالی ہند کے اکثر دیہاتی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں: اَقل (عقل)، اِجّت (عزت)، سال (سوال)، انام (انعام)، چیج (چیز)، متبل (مطلب)، اُمر (عمر)، جدّ (ضد)، کبجا (قبضہ) نہ کہ بدھی، آدریہ، پرشن، پرشکار، وستو، پریوجن، آیو، ہٹھ، ادھکار۔ یعنی دیہات کی زبان اُردو کے زیادہ قریب ہے۔ یوپی گورنمنٹ کے محکمہ دیہات سدھار کے ماہوار رسالے "ہل" میں دیہاتی بولیوں کے گیت شائع کئے جاتے ہیں مارچ سنہ ۱۹۴۷ء کے پرچے میں "پھاگن" پر ایک دیہاتی کی نظم ہے سے

آیا پھاگن کھلیان لگے گاؤں کے پھر ارمان جگے ❊ چھنٹ گئے اداسی کے بادل بیکاری کے شیطان بھگے

جدید سمپورنانندی ہندی اپنی کوٹھڑی بند کرکے پرانے سنسکرتی مُردے اکھاڑتی ہے۔ اُردو کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ صحیح قسم کی اُردو سنسکرت اور زندہ ہندستانی زبانوں سے عربی فارسی سے اور انگریزی وغیرہ سب سے اپنے ذخیرے کو مالامال کرتی رہتی ہے۔ اس غرض سے اگر آسان عام فہم ہندی کی بعض کتابیں اُردو میں شائع کی جائیں تو وہ بھی ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اُردو کو ایسی ہندی سے ڈرنے کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ کسی سے نفرت کرنا اُس کی فطرت کے خلاف ہے اُس کے ہاں اگر گھر تھانہ کوٹھڑی چوکھٹ گھڑیال دال لڈو بیڑا کی جگہ ہے تو قلم دوات کتاب مقدمہ کاریگر کبوتر بلبل طوطا کی گنجائش بھی ہے اور ساتھ ہی وہ جج بیرسٹر پتلون کوٹ سٹیشن ریل مشین گلاس ریڈیو نمونیا ملیریا کو بھی سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے اور اُردو محض غیر زبانوں کی پرانی لکیر کی فقیر نہیں جب جی میں آئے تصرف بھی کر لیتی ہے۔ مواد اصل مشکور مسالہ تکلیف ظرافت تہین کے معنی درہ خیبر سے پرے کچھ اور ہیں ہمارے ہاں اور ہیں۔ اُردو بخشنے خزینے تراشنے ہی پر بس نہیں کرتی اُس کی ایجادیں ایسی ایسی ہیں جیسے ہائش سمجھدار ڈاک خانہ چھٹی سال فوق البھڑک اِس سے اُس کی ملنساری ظاہر ہوتی ہے۔ اور جو لفظ اُس کے گھر میں آگیا پھر عموماً اُسے دیس نکالا نہیں دیا جاتا۔ آج کل ریڈیو کے سلسلے میں اُردو کے عام فہم لفظوں پر اعتراض کرنے کا پروپگنڈا جاری ہے۔ "نیشنل ہیرلڈ" نے اپنے ۲ر اگست ۴۷ء کے پرچے میں ان الفاظ پر اعتراض کیا: عرصہ، سیاسی، تقریر، تاریخ، جمہوریت، سفیر، اخلاق، تجویز، نمائندے، انقلاب۔ اِسی تاریخ کے ہندستان ٹائمز میں بعض اور الفاظ پر ناک بھوں چڑھائی گئی: بین الاقوامی، آتشدان، بحرالکاہل، اقتصادی، ساحل، وزیرِ اعظم، جمہوریت اور ان کے بجائے یہ الفاظ تجویز کئے گئے: انتر شٹریا، انگیٹھی، پرشانت ساگر، ارتھک، تٹ، پردھان منتری، پرجا تنتر۔ اس پر "ہماری زبان" نے ہندی اخبارات اور ہندی کے لغات "شبد ساگر" کے حوالے سے ثابت کر دیا کہ اُردو کے سب یہ الفاظ خود ہندی میں اور ہندوؤں کے ہاں مروج ہیں اور سوائے انگیٹھی کے جو اُردو بھی ہے مجوزہ ہندی لفظوں کے سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ خود ہندی کے بعض دُور اندیش رہنماؤں نے ہندی والوں کو عربی فارسی کے مستعمل لفظ نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا ہے۔ بابو راجندر پرشاد نے سنہ ۱۹۳۶ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کی صدارت کرتے ہوئے اِس

بات پر خاص زور دیا۔ گارساں دتاسی کی رائے ہے کہ اُردو سے فارسی عربی لفظ نکالنا ایسا ہی ہے جیسے انگریزی سے اُن فرانسیسی الفاظ کا نکالنا جو نارمن فتوحات کے ساتھ آئے تھے۔ ملکی نقطۂ نظر سے اگر ہندوستانی سیاست میں "پاکستان" کا نظریہ قابلِ اعتراض ہے تو اُسی نقطۂ نگاہ سے زبان میں "ہندستان" کا نظریہ بھی کچھ کم تفرقہ ڈالنے والا نہیں۔ ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے ہم کس طرح ایک دوسرے سے مُنہ پھیر سکتے ہیں۔ اگر ہم ہندوستان کو بولیوں کے لحاظ سے بابل کا بُرج بنا دیں گے تو گویا خود ہی اپنی تباہی کا سامان تیار کریں گے ورنہ ہندوستان آپ سے آپ دو بلکہ بہت سے حصّوں میں منقسم ہو جائے گا۔

خوش قسمتی سے ہندی کی عام غلط روش سے متاثر ہو کر کئی **ہوش مند ہندو** اُردو کا ساتھ دے رہے ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو کا ذکر ہو چکا ہے۔ وہ اُردو کے سب سے بڑے منظم ادارے انجمن ترقیٔ اُردو کے صدر ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم، پنڈت منوہر لال زتشی، پیارے لال شاکر، پنڈت کشن پرشاد کول، کیلاش ناتھ تکسر، پنڈت برجموہن کیفی، آنند نرائن صاحب ملا، منشی تلوک چند محروم اور بیسیوں اور بزرگ دل و زبان سے اُردو کی حمایت کر رہے ہیں۔ نوجوانوں میں کرشن چندر، عرش ملسیانی، راجندر سنگھ بیدی، اندرجیت شرما، تاجور سامری، جگن ناتھ آزاد اور سینکڑوں اور اصحاب اُردو کی خدمت کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ پنڈت کشن پرشاد کول کہتے ہیں "اُردو نہ مسلمانوں کی زبان ہے نہ ہندوؤں کی بلکہ دونوں کے اختلاط اور میل جول سے پیدا ہوئی۔ میری مادری زبان اُردو ہے اور میری تمام قوم کی (جسے کشمیری پنڈت کہا جاتا ہے) پیدائشی زبان بھی یہی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کشمیری قوم کے بعض افراد بھی اب اُردو چھوڑ کر ہندی کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔" پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی یہ کہہ کر کہ ریل پر اور رائج الوقت سکّے پر ہر جگہ اُردو نظر آتی ہے کہتے ہیں کہ "حکومت خود جانتی ہے کہ ہندوستان کی زبان اُردو ہی ہے۔" مسز نائیڈو نے دکشنی بھارت ہندی پرچارنی سبھا کے ایک جلسے میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا "اسی (ہندو مسلم) سمجھوتے کی زبان یہ اُردو ہے۔ میں اُردو کو برباد نہ ہونے دوں گی۔ اُردو مجھے بڑی پیاری ہے۔ میرے گھر میں اُردو کا مشاعرہ ہوتا ہے۔ میں اُردو پڑھ لیتی ہوں لیکن دیوناگری لیپی پڑھنے میں مجھے دقت ہوتی ہے۔" اور آخر میں کہا "ایک بولی سے ایک ہی دل ہوگا۔ ایک دل سے ایک ہی کوشش ہوگی۔ ایک کوشش سے ایک ہی قسمت ہوگی اور یہ قسمت ہی آزادی ہے۔" مسز وجے لکشمی پنڈت نے ایک پبلک جلسے میں یہ کہہ کر اپنی تقریر شروع کی کہ "اب میں اپنی مادری زبان یعنی اُردو میں تقریر کروں گی۔" جولائی ۱۹۴۰ء میں بزمِ ادب بھیلسہ کے شاندار مشاعرے میں منشی ودیا ندھ صاحب نے کہا "میں بہ حیثیت ہندو ہونے کے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا اُردو سے بہت گہرا تعلق ہے اور آج بھی میں اُردو کا عاشق ہوں۔" اسی ماہ میں کل ہند اُردو کانفرنس بریلی میں چودھری تعریف سنگھ صدر مجلس استقبالیہ نے کہا کہ "اُردو ہندو اور مسلمان دونوں کا مشترک سرمایہ ہے۔" سر سپرو نے (اگست ۱۹۴۰ء) سری نگر کشمیر میں ہندوؤں سے خطاب کر کے کہا "ہندو ہونے کی حیثیت سے آپ نہ اپنے فلسفے کو نظر انداز کیجئے اور نہ تہذیب و تمدن کے اُس گراں بہا خزانے کو جو آپ کو ورثے میں ملا ہے لیکن فارسی اور اُردو سیکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھئے۔" "یہ بڑی افسوسناک بات ہو گی اگر ہندی کو ترقی دینے کی جائز خواہش کے ساتھ آپ نے اپنے پر یہ لازم کر لیا کہ اُردو کے ساتھ بے وفائی کی جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی سب سے مضبوط کڑی ہے۔" لیکن بیچارے ہر دلعزیز سیاسی لیڈر بڑی مشکل میں پڑے ہیں۔ اُنہیں واقعات کو اپنی سیاسی اغراض کی عینک لگا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ گاندھی جی اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے آئے ہیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو ہند کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ اب ۷ مارچ ۱۹۴۰ء کو اُنہوں نے مولوی صاحب کو خط لکھ کر یہ یقین دلایا کہ "بے شک اُردو اُن حصّوں میں ہندوؤں مسلمانوں دونوں کی مادری زبان ہے جہاں اُس کو یہ حیثیت حاصل ہے۔" ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۶ جون کے مطابق مسٹر راجگوپال اچاریہ نے بھی مانا ہے کہ ہندوؤں مسلمانوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ اُردو ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے صاف اعلان کیا تھا کہ میری مادری زبان اُردو ہے۔ اس پر آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن والے تلملا اُٹھے۔ اُنہوں نے پنڈت جی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بیچارے پنڈت جی نے جواب دیا کہ ہاں میں نے

دو ایک بار کہا ہے کہ اُردو میری مادری زبان ہے اور میرا میلان کچھ اُردو اور فارسی کی طرف رہا ہے۔ مگر اُردو ہندی اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہیں۔ اخیر میں کہا کہ میں اُردو بہت کم پڑھ لکھ سکتا ہوں اور ہندی میں ہی اس سے اچھی طرح لکھ لیتا ہوں لیکن وہ بھی ذرا دقت سے۔" (۷ نومبر ۴۰ء) دیکھو ایک اتنے بڑے لیڈر کو زبان کے مسئلے میں کتنی کچھ دقت کا سامنا پڑتا ہے! کاش زبان اس طرح سیاست کی لپیٹ میں نہ آجاتی!

ہندوؤں نے گزشتہ زمانے میں اُردو کے لئے جو کچھ کیا اُس کے بیان کو تو ایک دفتر چاہیئے۔ "اُردو کے ہندو ادیب" میں اس کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر نول کشور پریس کی خدمات اور سرشار و چکبست کے نام ہی کافی ہیں۔ گزشتہ سال میں کالستھ سبھا دہلی نے ہندو شعراء کے کلام کا سلسلہ شائع کرنا شروع کیا ہے اور بھی بہت سے ہندوؤں کو یا اُردو سے دلچسپی ہے یا عملاً اُس سے تعلق ہے۔ اس کے برعکس فرقہ وارانہ فضا سے متاثر ہو کر ہزاروں ہندو بھائی بولتے اور لکھتے تو اُردو میں ہیں اُردو مشاعروں سے لطف بھی اُٹھاتے ہیں لیکن سیاسی فضا میں جا کر ہندی یا ہندوستانی کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتے ہیں۔ اکتوبر میں لاہور میں اسی ہندوستانی کے متعلق ایک جلسہ ہوا جس میں ایک ہندو لیڈر نے جو دراصل اُردو کے شیدائی ہیں پھر ہندوستانی کی رٹ لگائی۔ ایسے ہی واقعات سے متاثر ہو کر سر سپرو نے کہا ہے کہ "ہندوستانی کوئی زبان نہیں اس کا کچھ مطلب نہیں۔" "میں اس زبان کے لئے اُردو کا لفظ پسند کرتا ہوں جب کوئی میرے سامنے ہندوستانی کا لفظ کہتا ہے تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے اور سخت صدمہ ہوتا ہے۔" "ہندوستانی کی اصطلاح دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اپنی قومی زبان اُردو کو اُردو کہنے سے نڈر ہیں اور اعلان کے ساتھ کہیں کہ ہماری زبان اُردو ہے اور اُس کی عبارت کو ایسی سلیس بنائیں کہ اس کی اشاعت روز بروز بڑھتی جائے تو میں ہر حیثیت سے آپ کے ساتھ ہوں۔" "یہ زبان ہمارے آباو اجداد کا ایک ناقابلِ تقسیم مشترکہ اور مقدس ترکہ ہے جس کی نہ روح بدلی جا سکتی ہے نہ نام۔" صاحب موصوف نے سلاست کے متعلق ایک مثال دے کر اپنا مطلب واضح کیا ہے۔ کہ "تھرمامیٹر کو "آلہ مقیاس الحرارت" اور "خزانچی" کو "کوشادھیکش" کہنے والے قومی زبان کے گلے پر کند چھری پھیرتے ہیں۔"

ہر زبان کی علمی و ادبی صورت اُس کی عام بول چال سے قدرے مختلف ہوتی ہے اور ہندوستان سے ملک میں جہاں تعلیم یافتہ لوگ سات آٹھ فی صدی سے زیادہ نہیں یہ اختلاف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شمالی اور وسطی ہند میں جو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے وہ اُردو ہی ہے۔ اُسے آسان اُردو یا ہندوستانی کہہ لیجیے لیکن وہ عام طور پر جدید کتابی ہندی سے قطعاً علیحدہ ہے۔ دیہاتوں میں دیہاتی بولیاں ہیں۔ یہ ایک ظلم ہوگا کہ ہم ان خام بولیوں کے الفاظ کی بھرمار سے اپنی اخباری و ادبی زبان کو مسخ کر دیں بلکہ صحیح طریقۂ کار یہ ہوگا کہ ہم دیہات میں تعلیم پھیلائیں اور دیہاتیوں سے واسطہ پیدا کریں۔ اس سے قومی زبان خود بخود ملک کی مختلف بولیوں سے متاثر ہوگی اور آہستہ آہستہ اس کا ذخیرۂ الفاظ بڑھتا چلا جائے گا۔

ہندوستانی کے متعلق اب تک جو منظم کوششیں ہوئی ہیں وہ بالعموم ناکام رہی ہیں۔ ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ نے یوں مفید کام کیا ہے لیکن اُس کے اُردو ہندی کارنامے الگ الگ نظر آتے ہیں۔ کانگرس کی مقرر کردہ بہار کمیٹی کا کام جاری ہے لیکن ابھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا کیونکہ ہندوستانی کو خواہ مخواہ ہندی کی طرف گھسیٹنے کی کوشش بھی جاری ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک رکن عبدالعلیم صاحب نیا ادب میں لکھتے ہیں "کانگرس نے ہندوستانی کا نام تو لیا لیکن اُس کے لئے کام کچھ نہ کیا" بلکہ ہندوستانی کے ضمن میں بعض اہلِ اُردو نے نیک نیتی سے غور کیا ہے اور اس پر عمل بھی کر دکھایا ہے۔ اس کی ایک مثال مولوی ابوالقاسم کا تازہ مضمون "سوجھ بوجھ کے ڈھائی اکھر" ہے۔ پرنسپل ٹریننگ کالج حیدرآباد نے بنیادی اُردو کے ۹۰۰ الفاظ چنے ہیں۔ "نئے ادب" کے شائقین نے ایک بنیادی ہندوستانی کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ کیا ہے اور دیہاتی بولیوں کے مشترک الفاظ جمع کرنے کا تہیہ بھی کیا ہے۔ حکومتِ ہند کے مرکزی بورڈ آف ایجوکیشن کی ایک کمیٹی کا اجلاس

۱۵؍ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ہوا جس میں ہندوستان کے لئے مشترک اصطلاحات وضع کرنے کے مسئلے پر غور کیا گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے واضح کیا کہ گو موجودہ حالات میں سارے ہند میں ایک ہی مشترکہ مجموعۂ اصطلاحات ہونا ناممکن ہے لیکن اردو کی اصطلاحیں اگر انہیں سادہ اور آسان کر دیا جائے تو ملک کے تین چوتھائی حصے کے لئے کام دے سکتی ہیں خواہ رسمِ خط کچھ ہی ہو۔ دراوڑی زبانیں اپنا علیحدہ مجموعہ بنا لیں۔ اس تجویز پر کہ اصطلاحات انگریزی سے لے لی جائیں انہوں نے شدید اختلاف ظاہر کیا اور اس کی یہ پُرلطف مثال پیش کی: "تھرموڈائنمکس کے پہلے قانون سے یہ مطلب ہے کہ جب کسی کیمیکل ری ایکشن سے جس کی کیلوری فک ویلیو Z ہے ایکسٹرنل ورک کے یونٹس حاصل ہوتے ہیں اور حرارت کے Q یونٹس کی ایبسارپشن ہوتی ہے تو Q - A ، Z یا Z . A ، Q"۔ جیسا مولوی صاحب فرماتے ہیں "یہ بھی کوئی زبان ہے؟ کوئی سمجھدار شخص ایسی زبان لکھنے یا بولنے پر رضامند نہ ہوگا۔ زبان و ادب کے حق میں اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔"

مشترکہ زبان وضع کرنے کی کوششیں مبارک ہیں بشرطیکہ وہ نیک نیتی پر مبنی ہوں لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک ایسے ملک میں جو دوسرے ترقی یافتہ ملکوں سے ابھی کوسوں پیچھے ہے جہاں جہالت چاروں طرف چھائی ہوئی ہے جو ابھی غیروں کی غلامی میں گرفتار ہے جس میں ابھی اپنوں میں سو قسم کے مذہبی اور سیاسی تفرقے ہیں یہاں بنی بنائی مشترکہ چیزوں سے انسان منہ پھیر کر صدیوں کے کام کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے۔ سر سپرو کے قول کے مطابق "ملک میں سیاسی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں مگر زبان کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر ہاتھ ڈالا جائے۔"

اگر کانگرس ہمت کر کے اردو کو ملک کی مشترکہ زبان تسلیم کر لیتی تو اس کے اس ایک فعل سے ملک سیاسی اتحاد کی بیسیوں منزلیں طے کر جاتا لیکن ہندوستان کی قسمت میں غالباً ابھی بہت سی ناکامیاں اور جد و جہد لکھی ہے جس کا خدا جانے کب کچھ تسلی بخش نتیجہ نکلے۔ موجودہ حالات میں زبان کے مسئلے کے متعلق صحیح رویہ یہ ہے کہ اردو ہندی اور ملک کی دوسری زبانیں اپنی اپنی جگہ ترقی کریں، اپنے ادب کے ذخیرے کو بڑھائیں حتی المقدور اور حسبِ ضرورت اپنے الفاظ اور طرزِ ادا کو عام فہم بنائیں تعلیم کے دائرے کو عوام میں دن بدن وسیع کریں اور اس غرض سے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ کوئی کسی کے حلقۂ اثر میں ناجائز دخل نہ دے۔ ہندی ہندوؤں کی اور اردو مسلمانوں کی زبان نہ سمجھی جائے جو ہندو ہندی سیکھنا چاہیں انہیں اس امر کا پورا اختیار دیا جائے لیکن ساتھ ہی جو ہندو اردو جانتے ہیں وہ اس سے اپنا تعلق بدستور قائم رکھیں۔ دقت یہ ہے کہ موجودہ فضا اور ذہنیت میں اس معمولی سی بات پر بھی عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان حالات میں اردو کے لئے اپنی تعمیر کے ساتھ اپنی حفاظت کا خیال رکھنا لازم ہے یہ مقابلے کا زمانہ ہے اس لئے ہمیں چاروں طرف اپنی نگاہیں دوڑانی پڑیں گی۔ ہماری زبان ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچی ہوئی ہے اس لئے ہمارا محاذ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں اپنی ان پھیلی ہوئی ذمہ داریوں سے گھبرانا نہ چاہئے بلکہ مردانہ وار اور جہاں تک ہو سکے بغیر کسی تشدد کے اپنی زبان اور اس کے ذریعے سے اپنی تہذیب اور اپنے ملک کے تحفظ و ترقی میں حصہ لینا چاہئے۔

ہندی نے پچھلے چالیس سال میں بے حد ترقی کی ہے۔ انیسویں صدی کے آخیر تک اس کا لٹریچر بہت تھوڑا تھا۔ گوری سرن لال صاحب نے جنوری ۱۹۴۰ء کے "اردو" میں اس ترقی کی داستان بیان کی ہے۔ غدر کے بعد ہندوؤں میں اصلاحی تحریک اور تعلیم کے ساتھ جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی اس کی وجہ سے ان کی توجہ پھر خالص ہندو چیزوں کی طرف ہوئی اور یوں "موجودہ ہندی ایک خاص فرقے کے خیالات کی حامل" بنی۔ ناگری پرچارنی سبھا نے جو گویا ہندی والوں کی انجمن ترقی اردو ہے پچھلے چالیس سال میں ہندی کو بے حد ترقی دی ہے۔ بات بات میں اردو کا مقابلہ ہونے لگا۔ ہندی اردو کے تصادم سے "تصانیف و تالیفات کا ذخیرہ سمندر کی طرح ابل پڑا۔" اردو کی نقل میں ادارے بنے "ہندی کے رسالے اردو رسالوں کی پیروی کرنے لگے۔" تراجم کے ذریعے سے ہندی ادب کو دورِ حاضر کے خیالات سے مالامال کر دیا گیا۔ ادبی

ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کے کونے کونے میں اور ہندوؤں کے ایک ایک گھر میں رات دن ہندی کا پرچار کرنے کی سر توڑ کوششیں ہو رہی ہیں۔ ۱۷ فروری کو دہلی میں ہندی ہفتہ منایا گیا۔ ادھر کوہندی پرچارنی سبھاؤں کے ذریعہ سے کشمیر میں اردو ہندی کے متعلق بارہ ہزار ہندوؤں کی دستخطی یاددلشت حکومت کے روبرو پیش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکتوبر میں حکومت نے تعلیم کے لئے اُردو ہندی دونوں خطوں کے رائج ہونے کا حکم دے دیا۔ ۲۱ مارچ کو نروبتی میں مالوی جی کی صدارت میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس ہوئی جو فی الحقیقت ہندی سنسکرت کانفرنس تھی۔ ۷ رجون کو جمعیۃ العلماء کا جو اجلاس جونپور میں ہوا اُس کا اشتہار ہندی والوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ناگری رسم خط میں اس عنوان سے شائع ہوا "ہندوستان کے مسلمان نیتاؤں کا جونپور میں جمگھٹ"۔ لیکن آزاد مسلم کانفرنس نے اپنے جولائی کے اجلاس (لکھنؤ) میں اُردو دشمنی کی وارداتیں دیکھ کر اور اسے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک بڑا خطرہ سمجھ کر زبان کے مسئلے کی طرف خاص توجہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد کو ۹ ستمبر کو جو ایڈریس الہ آباد یونیورسٹی کے طلبہ کی طرف سے پیش کیا گیا وہ راشٹر بھاشا ہندی کے لئے پرچار تھا: [illegible] کا پرچار ہندی کے اختیاری مضمون کو اختیاری کر دیا۔ لا۲ فروری لیکن اس کے باوجود ۲۹ ستمبر کو مدراس تھا۔ مدراس میں کانگرس کی حکومت اُٹھ جانے کی وجہ سے حکومت نے ہندی کو بجائے لازمی مضمون کے اختیاری کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود ۲۹ ستمبر کو مدراس میں ہندی ہفتہ منایا گیا جس کے دوران میں مسٹر سیتا مورتی نے تقریر کی کہ ہر ہندو کو انگریزی سنسکرت ہندوستانی اور اپنی مادری زبان سیکھنی چاہیئے اور مسٹر پانڈلے نے ہندوستانی کی اہمیت جتاتے ہوئے کہا کہ بیرونِ ہند سے جو براڈکاسٹ ہوتے ہیں وہ اسی قومی زبان میں ہوتے ہیں۔ یہی بات مسٹر انظر داس میئر بمبئی کارپوریشن نے راشٹر بھاشا پرچار سمتی بمبئی کے جلسے میں ۲۸ نومبر کو کہی سوائے اس کے کہ اُنہوں نے "ہندی" کا لفظ استعمال کیا۔ الفاظ و واقعات کی یہ قلابازیاں ایک ہوش مند آدمی کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔ اگر اُس زبان کو جو لندن اور برلن اور روم اور کابل سے براڈکاسٹ کی جاتی ہے ہندی والے ہندوستانی بلکہ ہندی مان لیں تو زبان کا مسئلہ پل کی پل میں حل ہوا چاہتا ہے لیکن وہاں تو نیت ہی کچھ اور ہے جبھی تو یوپی سکریٹریٹ کی ہندی ساہتیہ سنگھ نے جون میں آل انڈیا ریڈیو کی زبان پر جس میں کئی ہندی کے الفاظ غیر ضروری طور پر استعمال ہونے لگے ہیں فارسیت کا الزام لگایا جس کے جواب میں حکیم حبیب اللہ صاحب نے جلسہ کر کے احتجاج کیا کہ اگر ایک فرقے کے سرکاری ملازم ریڈیو کے متعلق شور مچا ئیں گے تو دوسرا فرقہ بھی اس کا ترکی بہ ترکی جواب دے گا۔ مسلسل خاموش علمی و ادبی کام متواتر پُر شور پروپگنڈا ہندوؤں کی مذہبی و قومی جس کے نام اپیل، ہندوستانی کی آڑ میں ہندی اور ہندی کے ذریعے سے سنسکرت کا پرچار، عربی فارسی بلکہ خالص اُردو لفظوں کا باقاعدہ اخراج، یہ ہے ہندی والوں کا طریق جنگ اُردو کے خلاف؛ جہاں جو حربہ کام دے استعمال ہو رہا ہے اور منظم طور پر مسلسل استعمال ہو رہا ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے دہلی میں ہندی ہفتے کے ایک جلسے میں بتایا کہ اُردو کے ۵۳،۹۶۰ الفاظ میں سے اکیس ہزار چھ سو ہندی کے الفاظ ہیں عربی فارسی کے ۱۳،۶۲۵ اور خالص اُردو کے ۱۷،۵۰۰ یعنی اُردو کے ہر پانچ لفظوں میں سے دو خالص ہندی کے لفظ ہوتے ہیں اور صرف سو لفظ فارسی عربی کے[1] لیکن کون سنتا ہے طوطی کی نقار خانے میں۔ قومی تفریق اور علیحدگی اور زبان و خیالات کی شدھی کا کام برابر جاری ہے۔ صوبہ متحدہ میں ہندی پروپگنڈے کی یہ صورت ہے کہ سمپورنانند جی نے فخریہ دعویٰ کیا ہے کہ اب یہاں ہیں فیصدی طلبہ بھی اُردو نہیں لیتے۔ پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ صاحب فروری کے "زمانہ" میں رقمطراز ہیں کہ اُردو ہندوؤں کی غلامی کی نشانی ہے لوز ہندو جو اُردو کے شائق ہیں وہ اُردو کے لئے غیر ہیں۔ اُردو محض کاغذی زبان ہے جو چند شہروں کے سوا کہیں بولی نہیں جاتی اور آخیر میں یہ فلسفیانہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ "مذہبی جغرافیائی نسلی امتیاز تا ابد نہ مٹیں گے۔" یہ ہے کاغذی زبان میں کاغذی گھوڑے دوڑانا۔ ہم سفر دوستو! ہوشیار خبردار!

---

[1] یہ اعداد فرہنگ آصفیہ جلد چہارم سے لئے گئے ہیں۔ اب اُردو کے الفاظ کی مجموعی تعداد بہت بڑھ گئی ہے شاید اس سے دگنی تگنی سے بھی زیادہ ہو۔ اس لحاظ سے عربی فارسی کا حصّہ اور بھی کم سمجھنا چاہیئے۔

پروفیسر مُرلی دھر نے مارچ اور اپریل کے ماڈرن ریویو میں (قومی زبان پر اپنے مقالے میں) کُل ہند اُردو کانفرنس کی طرف سر سپرو کے پیغام کا ذکر کر کے یہ عالمانہ لکھا ہے کہ "کاش اُردو کے لمبے کو زمین کے ساتویں پرت کے نیچے ایسا دفن کر دیا جائے کہ آثارِ قدیمہ کے ماہر آج سے پانچ ہزار سال کے بعد جب زمین کھودیں تو تعجب کریں کہ یہ کوڑا کرکٹ کہاں سے آیا!" ذرا سمجھو کہ اس کے کیا معنی ہیں؛ جس ملک کے ماہرینِ تعلیم ایسی تعصب بھری باتیں لکھیں اور جہاں کا ایک مشہور رسالہ فخر سے اُن کی اشاعت کرے اُس ملک کی کیا حالت ہوگی اور خدا بچائے کیسا انجام ہوگا؛ لاہور میں ہندی کے دن کے سلسلے میں جو جلسہ کانگرسی لیڈر ڈاکٹر بھارگوا کی صدارت میں ۱۰ مارچ کو ہوا اُس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ پنجاب میں اردو ہندی اور پنجابی تینوں ذریعۂ تعلیم قرار دی جائیں۔ ۱۰ اکتوبر کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں پروفیسر گلشن رائے نے حالی، شرر اور اقبال جیسے شاعروں اور ناول نویسوں کی تصنیفات پر یہ الزام دھرتے ہوئے حکم لگایا کہ اُردو کا ارتقا یعنی ہندوستانی یا ہندی کی تفریس بھی مایوسی کے آثار کی علامت تھی۔ ۲۷ نومبر کے ٹریبیون میں ایک ہندی کے پریمی پنجاب میں ہندی کتابوں میں اُردو الفاظ دیکھ کر ایسی ہندی کو "مسخ شدہ زبان" کہتے ہیں، اور ہندی اور ہندو دھرم کے تمام عاشقوں سے احتجاج بلند کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے تین روز بعد لاہور میں جو آریا بھاشا سمیلن کانفرنس ہوئی اُس میں اتحادی حکومت کی اُردو پسندی کے خلاف احتجاج کیا گیا اور یہ قرارداد باتفاقِ رائے منظور ہوئی کہ پنجاب میں ہندی ذریعۂ تعلیم بنائی جائے۔ سندھ میں (۲۷ جولائی کو) حکومت نے یہ سرکلر جاری کیا کہ صوبے کے تمام مدرسوں میں بشمول اُردو مدرسوں کے سندھی زبان کی تعلیم رائج کی جائے۔ اس پر عوام کا ایک احتجاجی جلسہ ہوا۔ ہندی والوں کی مدت سے یہ کوشش رہی کہ سندھ میں کسی طرح اُردو کو ترک کر دی جائے۔ کشمیر کی حکومت نے اُردو پر سب سے بڑا حملہ کیا ہے ہندی کو کشمیر سے دُور کا واسطہ بھی نہیں بلکہ وہاں ہمیشہ فارسی اور اُس کے بعد اُردو رائج رہی ہے۔ حکومت نے جو تعلیمی کمیٹی ۱۹۳۸ء میں بٹھائی تھی اُس نے متفقہ طور پر سفارش کی کہ کشمیر میں رسم الخط بدستور سابق اُردو ہی رہنا چاہیے۔ اور تنبیہ کی کہ اگر ہندی خط کو دخل دیا گیا تو ہندو مسلمان دو الگ قوموں میں تقسیم ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس کے باوجود حکومت نے اکتوبر ۱۹۴۰ء میں اعلان کر دیا کہ کشمیر میں تعلیمی زبان تو آسان اُردو ہوگی لیکن طلبہ کو اختیار ہوگا کہ اپنی تعلیم اُردو یا ناگری خط میں حاصل کریں، اور اس لئے معلّمین کے لئے اُردو ہندی دونوں کا جاننا لازم قرار دیا گیا۔ اس پر ۲۱ اکتوبر کو کشمیر اسمبلی میں زمیندار پارٹی اور نیشنل پارٹی نے مل کر واک آؤٹ کا مظاہرہ کیا۔ ۳ نومبر کو مشہور نیشنلسٹ لیڈر شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے اُردو کے حق میں ایک عام جلسہ میں زبردست تقریر کی اور ۴ نومبر کو کشمیر نیشنل کانفرنس کی کمیٹی نے گورنمنٹ کے احکام پر سختی سے احتجاج بلند کیا جس پر شیخ عبداللہ کے پرانے رفیق کار پریم ناتھ بزاز نے نیشنل کانفرنس سے استعفا دے دیا۔ زبان کے معاملے میں اب فرقہ وارانہ فضا اس حد تک مکدّر ہو چکی ہے۔ صد حیف!

کوئی سچا محبِ وطن اور اتحاد و آزادی کا کوئی حامی ان حالات پر تشویش ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن تشویش کے بار بار اظہار سے زندگی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں تخریب کی قوتیں اس قدر سرگرم ہو جائیں وہاں بہترین طریقِ عمل مناسب مدافعت کے بعد اور زیادہ توجہ اور ہمت اور استقلال سے تعمیری کاموں میں منہمک ہو جانا ہے۔ یہ امر غور کے قابل ہے کہ ہر چند اُردو پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں؛ اُس کے خلاف ایک منظم سازش جاری ہے اور ملک کے بعض حلقوں میں فرقہ وارانہ پروپگنڈا کی وجہ سے بعض لوگ اُس سے کنارہ کر چکے ہیں تاہم ملک کی ایک فطری ضرورت ہونے کی وجہ سے اُردو کی حیثیت اب بھی مضبوط ہے اور اگر اُس کے حامی اُردو کی خدمت کے شوق کو جو ڈیڑھ دو سال سے صاف ظاہر ہو رہا ہے اور بڑھائیں گے اور کچھ کر دکھائیں گے تو یقین ہے کہ باوجود بعض خساروں کے اُردو کی دلکشی اور مقبولیت اُسے ملک میں اور زیادہ قوی اور ہمہ گیر بنا دے گی۔ مقابلہ سخت ہے لیکن اُردو والے خاطر جمع رکھیں کہ وہ

نہتے نہیں۔ اگر وہ ہمت سے کام لیں گے تو نصرت یقیناً اُن کا ساتھ دے گی!

اس وقت ہندوستان کی کوئی مسلمہ **ملکی زبان** نہیں لیکن وہ زبان جو ہندوستان کے طول و عرض میں سمجھی جاتی ہے جسے یہاں کے چالیس کروڑ باشندوں میں سے کم از کم پچیس کروڑ بول سمجھ سکتے ہیں وہ یقیناً اُردو ہے اور موجودہ حالات میں یہی ملکی زبان بننے کی اہل ہے۔ یہ ایک مخلوط اور مرکب زبان ہے اس میں مختلف تہذیبوں کے عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ اور زبانوں میں اکیلی یہی صحیح ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ بن سکتی ہے جیسا کہ پنڈت کیفی صاحب اپنے ایک تازہ مقالے میں لکھتے ہیں "اُردو ابتدا سے ہندوستان کے عام لوگوں کی زبان رہی۔ مسلمان بادشاہوں کے دربار کی زبان ہمیشہ فارسی تھی" اور اخیر میں یہ بتا کر کہ ہماری موجودہ کلچر ہندوستانی کلچر ہے کہتے ہیں کہ "درحقیقت اُردو پر ہندو کلچر کا رنگ غالب ہے" اُردو اسی ملک کی پیداوار ہے۔ عام فہم ہے اس کے حروفِ تہجی اور اس کی نظم و نثر کے قاعدے ملکی ضروریات کے مطابق ہیں اور جہاں نہیں ہیں ایسے بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ کامیابی سے ایک علمی زبان بن رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک لوچ دار اور ملنسار زبان ہے ریل پر سکوں پر ڈاک خانوں میں بڑے بڑے شہروں کے بازاروں میں دیہات کے کھیتوں میں دوسری زبانوں کے مقابل میں اس کا سب سے زیادہ چلن ہے ملک کے ۸۱ بڑے اخبارات و رسائل میں سب سے زیادہ اُردو کے ہیں یعنی ۸۱۲ اس کے بعد ہندی کا درجہ ہے یعنی ۱۰۱۔ اُردو کا خط خوبصورت اور مختصر ہے اور یہ بیسیوں اَور قوموں کا بھی رسمِ خط ہے جو بحر الکاہل سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک ہزاروں میل کی مسافت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جاپان افغانستان عرب مصر اور انگلستان کی بعض یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لندن، برلن، روم، کابل سے جس ہندوستانی میں ریڈیو پر خبریں وغیرہ نشر کی جاتی ہیں وہ خالص اُردو ہوتی ہے۔ ۱۰ اپریل ۴۲ء کے پائنیر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک انگریز اور ڈچ جب کسی طرح ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکے تو اُنہوں نے ہندوستانی میں ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھایا (دیکھو "ہند و ادیب") برما میں (مختلف قوموں کے درمیان) اُردو ہی عام مشترکہ زبان ہے۔ سعید بابروی صاحب درگی زویمر کا قول نقل کرتے ہیں کہ "اُردو بولنے والے دنیا میں سب سے زیادہ ہیں" ہندوستانی فوجوں کی زبان اُردو ہے۔ ۱۰ جنوری ۴۶ء کے اسٹیٹسمین میں بتایا گیا ہے کہ فوجی حکام اس پر مصر ہیں کہ نوجوان افسروں کو اُردو میں کافی مہارت حاصل کرنی چاہئے کیونکہ یہ اُن کے فرائض کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے۔ اسلام کی تبلیغ اور ہندو دھرم کا پرچار سب سے زیادہ اُردو کے ذریعے سے ہوا ہے۔ صوفیائے کرام نے جب ہندوستان کے عوام کو اسلام کا پیغام پہنچایا تو اُنہیں لامحالہ اسی عام فہم زبان کو استعمال کرنا پڑا۔ ہندو دھرم کی اکثر مشہور کتابیں اُردو میں منتقل ہو چکی ہیں بھگوت گیتا کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں حال میں ایک عمدہ منظوم ترجمہ ہوا ہے۔ اکتوبر ۴۶ء کے ہمایوں میں گوری سرن لال صاحب کا ایک دلچسپ مقالہ "ہندی پر اُردو کا اثر" شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ "ادبی لسانی اور فنی اِن تینوں حیثیتوں سے اُردو نے ہندی کی کایا پلٹ کر دی ہے"۔ "ہندی پر اُردو کا اثر اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے"۔ اگرچہ "اُردو نظم ہندی نظم سے بہت آگے نکل گئی ہے" لیکن اُردو نظم نے کئی طرح سے ہندی نظم پر اثر ڈالا ہے۔ مسدس حالی کے تتبع میں میتھلی سرن گپتا نے بھارتی لکھی۔ حالی، چکبست، اکبر کا کلام جابجا کاتوں ہندی میں چھاپا گیا۔ پنڈت مالوی کی بنائی ہوئی سنسکرت آمیز ہندی کا ردِ عمل پریم چند اور سدرشن کی طرف سے ہوا یہاں تک کہ آج کل ہندی کے اخبارات و رسائل میں بھی اُردو نما ہندی کا رواج ہو رہا ہے۔ یہ صورتِ حال امید افزا ہے۔ اس کے علاوہ اب بھی بیسیوں ہندو مصنف اور شاعر اُردو اور صرف اُردو کے مصنف اور شاعر ہیں اور اُس میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ اُردو کے مشاعرے ملک کے شہر شہر میں اس قدر مقبول ہیں کہ بے شمار اَن پڑھ لوگ اور ہندی کے رسیا بھی اِن جلسوں کو اپنے دم قدم سے رونق بخشتے نظر آتے ہیں۔ اُردو مشاعروں میں خواہ کتنے عیب ہوں یہ واقعہ ہے کہ تفریحِ طبع کے لئے لوگ اِن کی طرف اس طرح

رجوع کرتے ہیں جس طرح تھیٹروں اور سنیماؤں کی طرف۔ راگ رنگ کی محفلوں میں اُردو غزلیں بے حد مقبول ہیں اور کچھ دیر پکے گانے یا ہندی ٹھمریاں سُننے کے بعد ہمیشہ غزلوں کے لئے ہر طرف سے فرمائش ہوتی ہے۔

اُردو شاعری پر دوست دشمن طرح طرح کے آوازے کستے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہزاروں ایسے جواہر ریزے ہیں جو دنیا کی بہترین نظموں اور اشعار کے مقابلے میں پیش کئے جاسکتے ہیں اور ہندوستان کی تو کوئی زبان نظم کے ایسے متنوع نمونے نہیں رکھتی۔ غالب انیس، حالی، اقبال اپنے تخیل اپنی رَوانی اپنی واقعہ نگاری اور زندگی بخش پیغام کی دل آویزی میں دُنیا کے کسی شاعر سے کم نہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ اگر اردو نظم کا ایک صحیح انتخاب شائع کیا جائے تو وہ اَور زبانوں کے بہترین انتخابِ سخن کے پہلو میں جگہ پالے۔ اُردو ادب روز بروز اپنا ذخیرہ بڑھا رہا ہے اُس پر اب قیانوسیت کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ سیاسی اور معاشی باغیوں نے بھی اس کو اپنے خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ جوش نیاز اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے بہت سے نوجوان ادیب (جس انجمن کی بنیاد ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں رکھی گئی) اُردو کے ایوان میں اپنے انقلابی نعروں سے گونج پیدا کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں نوجوان مصنفین نے اپنے افسانوں کی کئی اچھی **کتابیں** شائع کیں۔ ان کے علاوہ دنیائے حاضر کے متعلق سیاسیات کی پہلی کتاب" "عہدِ حاضر کے بڑے لوگ" "یورپ کے تاثرات" "نئے مسائل" اور "طلسمِ عمل" (جو کارنیگی کی ایک مشہور کتاب کا ترجمہ ہے)، "سائنس میں حیات کیا ہے؟" اور "سائنس کے کرشمے" کی طرح کی کتابیں شائع ہوئیں۔ حالاتِ حاضرہ اور ملکی حالات سے آگاہی بہم پہنچانے کے لئے انجمن ترقی اُردو مختصر آسان کتابیں سیاست، صنعت و حرفت، ہیئت، طبیعیات، فلسفہ، تعلیمی نفسیات وغیرہ پر لکھوانے کا انتظام کر رہی ہے۔ بعض کتابوں کے عنوان حسبِ ذیل ہیں: "ہمارے مزدور"، "ہماری زراعت"، "ہماری تجارت"، "ہماری صنعت"، "ہمارا پیسہ"، "ہماری سیاسیات"۔ شعر و شاعری میں یادِ اقبال اور یادِ چکبست کے یادگاری ادب کے علاوہ متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں عظمت اللہ خاں مرحوم کا مجموعہ "سُریلے بول" ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کے متعلق ٹھیک کہا گیا ہے کہ وہ ناگری خط میں چھپ کر ہندی ادب کے لئے بھی ایک عمدہ اضافہ ثابت ہوگی۔ اُردو کتابوں کا ناگری خط میں شائع ہونا ہندی کو اُس بے راہ روی سے روکے گا جس کا اثر بالآخر ملک و قوم کے لئے گمراہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ گزشتہ سال میں اُردو دانی کے سلسلے میں جو مفید کتابیں شائع ہوئیں ان میں سے بعض یہ ہیں "اصطلاحاتِ پیشہ وراں"، "بولتا قاعدہ"، "بچوں کا قاعدہ"، "اُردو دانی"، "آسان اُردو"، "مغربی تراجم"، "فنِ تقریر"، "زباندانی"۔ جامعہ ملیہ کے سلسلۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ تاریخ ادب کی چند کتابوں کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ قدیم **اُردو ادب** سے متعلق "اُردو مثنوی"، "پھول بن"، "طوطی نامہ"، "محمد قلی قطب شاہ" وغیرہ کتب طبع ہوئیں۔ ایک مصنف نے یہ جدت کی کہ اپنے خراب مضمون بھی شائع کر دیئے۔ یہاں صرف ادب کی بعض اقسام کا ذکر کیا گیا ہے اور نمونے کے طور پر صرف چند کتابیں گنوائی گئی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوسکتا ہے کہ کس قسم کا مطلوبہ لٹریچر شائع ہو رہا ہے۔

اُردو کی عام **سرگرمیاں** سال بھر جاری رہیں۔ ۱۹۳۹ء کے آخری تین دنوں میں دہلی میں انجمن ترقی اُردو کے اہتمام میں **کُل ہند اُردو کانفرنس** کا شاندار اجتماع نواب مہدی یار جنگ کی صدارت میں ہوا جو اُردو کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ۲۸ دسمبر کو ادبی کمیٹی، اصلاح زبان کی کمیٹی، ٹائپ کمیٹی، سائنس کمیٹی اور انجمن کی شاخوں کی کمیٹی نے اپنا اپنا جلسہ کیا۔ ۲۹ کو اکابر کے پیامات اور خطبۂ استقبالیہ کے بعد خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔ پھر سکرٹری نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ شام کو علمی نمائش ہوئی۔ دوسرے دن بہت سی تجویزیں پیش ہو کر منظور ہوئیں ایک مجلسِ دستور قائم کی گئی۔ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کو اُردو کی طرف متوجہ

کیا گیا۔ ریڈیو پر نکتہ چینی کی گئی۔ ایک تجویز ٹائپ کے متعلق تھی۔ ایک کا مدعا قومی اور تجارتی اداروں میں اُردو کے استعمال پر زور دینا تھا۔ پنجاب میں اُردو کے ذریعۂ تعلیم بنائے جانے کی تجویز راقم (بحیثیت سکرٹری انجمن اُردو پنجاب) نے پیش کی۔ اسی دن شام کو ایک عظیم الشان مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں دہلی میں یوم اُردو (۷) اور علی گڑھ میں اُردو ہفتہ منایا گیا (۲۵)۔ اور راقم نے پنجاب یونیورسٹی میں تحریک کی کہ قدیم السنۂ مشرقیہ کے لئے ذریعۂ امتحان بجائے انگریزی کے دیسی زبانوں کو قرار دیا جائے۔ فروری میں (۲) اہلِ اُردو کے وفد نے گورنر سی پی سے ملاقات کی، انجمن بہارِ ادب کا سالانہ مشاعرہ زیرِ صدارت سر سپرو ہوا۔ (۲) لائل پور میں پنجاب اُردو کانفرنس ہوئی (۱۱)۔ اور دہلی میں یومِ برق منایا گیا (۱۱)۔ مارچ میں مولوی عبدالحق صاحب کی صدارت میں ناگپور میں اُردو کانفرنس ہوئی (۲۴)۔ کابل سے اُردو میں براڈ کاسٹ ہونے لگا (۶)۔ دہلی میں اُردو ہفتہ منایا گیا (۲۰)۔ انجمن ترقیٔ اُردو کراچی نے اپنی ۲۵ سالہ روپہلی جوبلی منائی (۲۲) اور لاہور میں اُردو کی حفاظت و ترقی کے لئے سکرٹری انجمن اُردو پنجاب کی "سرپرستی" میں ایک پندرہ روزہ پرچہ "نوائے وقت" جاری کیا گیا (۲۹)۔

اپریل میں ملک بھر میں یومِ اقبال منایا گیا۔ مئی میں لندن سے ریڈیو کی خبریں اُردو میں نشر ہونے لگیں اور سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو صوبۂ متحدہ نے صوبے میں جا بجا دورہ کیا۔ جون میں مولوی عبدالحق صاحب نے جنوبی ہند کا سفر کیا اور متعدد مقامات پر تقریریں کیں اور اُردو کے لئے متفرق کام کیا۔ جولائی میں بریلی میں ایک اُردو کانفرنس خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صاحب صدیقی کی صدارت میں (۲۱) اور ایک اُردو کانفرنس نواب صدیق علی خاں کی صدارت میں آمبور (مدراس) میں (۱۵) منعقد ہوئی، نیز کلکتہ میں اُردو فلم جرنلسٹس ایسوسی ایشن بنائی گئی۔ اگست میں بمبئی میں بھی ایک ایسی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ سر سپرو نے سری پرتاپ کالج سری نگر (کشمیر) میں اُردو کے حق میں اپنی معرکۃ الآرا تقریر کی اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو (حیدر آباد دکن) کے اُردو امتحانات ہوئے۔ ستمبر میں انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) نے اُردو کے امتحانات کی تیاری کے لئے اُردو کالج کھولا۔ اور ڈاکٹر رضی الدین (جامعہ عثمانیہ) کے لئے نوبل پرائز تجویز ہونے کی اطلاع ملی۔ اکتوبر میں حکومتِ کشمیر کی ہندی پسند پالیسی پر وہاں کی اسمبلی میں احتجاج بلند کیا گیا۔ بمبئی کے اُردو مدرسوں سے ہندی تعلیم خارج کر دی گئی اور پنجاب یونیورسٹی کے اقتصادی بورڈ نے تجویز کی کہ ایف اے میں اقتصادیات کی تعلیم بجائے انگریزی کے اُردو میں دی جائے۔ نومبر میں ہندوستانی کمیٹی بہار میں مولوی صاحب نے اُردو کی نمائندگی کی۔ اور دسمبر میں (۸ کو) لاہور میں ایک اُردو کانفرنس مولوی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ حکومتِ پنجاب نے جبری تعلیمی بل کے ضمن میں ۹ دسمبر کو اپنی پالیسی کا اعلان کیا کہ اُردو پنجاب کی سرکاری اور عدالتی زبان ہے اور صرف یہی ذریعۂ تعلیم ہے۔ ہندی اور گورمکھی کی امداد کی جا سکتی ہے لیکن اُنہیں ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا جا سکتا اور سال کی آخری اُردو سرگرمی یہ تھی کہ کانپور میں کُل ہند اُردو کانفرنس کے ۲۵ ۲۶ دسمبر کو زیرِ صدارت سر عبدالقادر منعقد ہونے کا اعلان کیا گیا۔

اُردو کے متعلق منظم کوششیں جاری ہیں: "جدید دَور کا وہ عہد آفریں کارنامہ جس نے اُردو زبان کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا اور جس کی وجہ سے جملہ علوم و فنون کے خزانے اُردو میں منتقل ہو گئے جامعہ عثمانیہ اور اُس کے دارالترجمہ کا قیام ہے"۔ "ہندوستان کی کسی زبان میں جدید ترین علوم و فنون کی اتنی وافر کتابیں موجود نہیں ہیں۔ دیوان بہادر رنگاناتھن وائس چانسلر مدراس یونیورسٹی نے ۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو جامعہ عثمانیہ کی کانووکیشن میں اپنے خطبے میں کہا کہ اس یونیورسٹی کا دارالترجمہ جملہ علوم کی کتابیں اُردو میں منتقل کرنے میں اعلیٰ درجے کا کام کر رہا ہے۔" انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) جس کی ابتدا ۱۹۰۳ء میں ہوئی لیکن جس نے دس سال بعد مولوی عبدالحق صاحب کی سرکردگی میں باقاعدہ کام شروع کیا، اب نہ صرف اُردو ادب کی معاون بن رہی ہے بلکہ اُردو کی اشاعت

کی ذمہ دار بھی ہو چکی ہے۔ اس وقت تک انجمن نے مختلف موضوعات پر ۲۰۵ کتابیں شائع کی ہیں ملک بھر میں اس کی ۹۰ شاخیں قائم ہیں اور ۸۰۵ مدارس۔ ایک سفیر بھی ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو مولوی عبدالحق صاحب جنہیں بجا طور پر "اُردو مولوی" اور "اُردو یار جنگ" کا خطاب دیا گیا ہے اُردو کی دنیا کے مسلّمہ اور ہر دلعزیز آمر ہیں جن کے اُردو مشغلوں اور ادبی سرگرمیوں سے اُردو زبان کی رگوں میں برابر خون دوڑتا رہتا ہے۔ جب سے انجمن کا دفتر (۱۹۳۹ء سے) دہلی میں منتقل ہو گیا ہے انجمن کی باقاعدہ رجسٹری ہو گئی ہے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور مولوی سید ہاشمی صاحب ایک باقاعدہ عملے کی مدد سے مختلف مفید کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ انجمن کے پندرہ روزہ اخبار ہماری زبان کی اشاعت اس وقت چار ہزار کے قریب ہے اور وہ اُردو کی حفاظت و اشاعت کا کام نہایت خوبی سے سرانجام دے رہا ہے۔ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) اور جامعہ ملیہ (دہلی) اُردو دنیا کے دو مشہور و مفید مستقل ادارے ہیں جو باقاعدگی سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں چند منچلے انقلاب پسند نوجوانوں نے **انجمن ترقی پسند مصنفین** کی بنا ڈالی اور قدامت پسندی اور رومانیت پرستی کو جھنجھوڑ کر اُن کی میٹھی نیند سے جگانا چاہا۔ یہ لوگ اُردو ادب کو ایک نئی ڈگر پر چلانے کے لئے بے قرار ہیں۔ گزشتہ سال ان کی ایک تالیف "آزادی کی نظمیں" ضبط ہو چکی ہے پھر بھی اُردو کے نقطۂ نگاہ سے اِن لوگوں کی جدت پسندی اور عوام سے واسطہ پیدا کرنے کی خواہش لائقِ ستائش ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد (دکن) نے پچھلے دس برس میں تقریباً ساٹھ کتابیں شائع کی ہیں اور اس ادارے نے اور انجمن ترقیٔ اُردو (حیدرآباد) نے دکن میں اُردو کی ترقی و اشاعت کے کام میں بڑی تندہی دکھائی ہے۔ ۱۹۳۹ء سے آگرہ میں ایک نیا ادارہ جامعۂ اُردو قائم کیا گیا ہے جس کی نگرانی میں اُردو امتحانات منعقد کئے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور بہت سے ادارے اور بڑی چھوٹی انجمنیں اور اخبارات اور رسائل اور مصنفین اپنی اپنی جگہ قوم و زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ کسی نے آج کل کے دور کو اُردو رسالوں کا دور کہا ہے۔ گزشتہ سال میں علاوہ رسالوں کے شاندار سالناموں کے ندیم کا بہار نمبر، جوہر کا عبدالحق نمبر، ادب لطیف کا افسانہ نمبر، ساقی کا افسانہ نمبر اور نگار کا نظیر اکبرآبادی نمبر شائع ہوا۔ ان کے علاوہ کئی اجتماعی اور انفرادی گمنام کوششیں ہوتی رہتی ہیں جن سے اکثر اہلِ اُردو بے خبر رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال بنگلور میں دیکھو جہاں سینٹ جوزف کالج کے اُردو پسند طلبہ نے ۱۹۴۰ء کا سالنامہ شائع کیا ہے جو ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح پروفیسر نجیب اشرف ندوی بمبئی میں ۱۲ اُردو سکول چلا رہے ہیں اور اس کے علاوہ بھی بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ اُردو کی خدمت کے سلسلے میں پنجاب کا بھی کچھ ذکر کیا جائے۔ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں اُردو پنجاب سے شروع ہوئی اور آج بھی جب کہ اکثر پنجابیوں کی مادری بولی پنجابی ہے اُنہوں نے اُردو کو اپنا کر اسے مشترکہ قومی زبان تسلیم کر لیا ہے۔ اُردو پنجاب کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ اُردو کے جتنے اخبارات و رسائل لاہور سے شائع ہوتے ہیں اور کسی شہر سے شائع نہیں ہوتے اور جتنی اُردو کتابیں ہر سال پنجاب میں چھپتی ہیں اور کسی صوبے میں نہیں چھپتیں۔ مصنفِ "تاریخ ادبِ اُردو" (مطبوعہ حیدرآباد) لکھتے ہیں کہ "گزشتہ ربع صدی میں پنجاب نے اُردو صحافت کی ایسی گراں قدر خدمت کی ہے کہ رسالوں اور اُن کے سالناموں کی حد تک اُردو زبان یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہمدوش ہو گئی ہے۔" جنوری تا ستمبر ۱۹۴۰ء کے نو ماہ میں پنجاب میں ۸۲۸ اُردو، ۱۰۷ ہندی اور ۱۲۱ گورمکھی کتابیں چھپیں۔ ۱۹۳۹-۴۰ء میں پنجاب کے اخبارات و رسائل کی مجموعی تعداد تقریباً ۸۲۵ رہی۔ اس میں تقریباً ۵۰۰ اُردو، ۱۱۰ انگریزی، ۶۰ گورمکھی اور صرف ۲۰ ہندی تھے۔ لاہور کے روزانہ اخبارات میں سے دس مشہور روزنامے (احسان، زمیندار، انقلاب، شہباز، پرتاب، ملاپ، ہندی ملاپ، ویر بھارت، ہندو، اکالی (پنجابی)) ۵۰۰۰۰ کے قریب چھپتے ہیں جن میں ہندی اور پنجابی کا حصہ صرف ۸۰۰۰ ہے یعنی ان دونوں کی نسبت

ملا کر آٹھویں حصے سے بھی کم ہے۔ ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کے انٹرنس کے امتحان میں جن ۲۷،۶۹۶ طلبہ نے جغرافیہ اور تاریخ کا پرچہ لیا، اُن میں سے ۲۳،۹۲۶ نے اُردو، ۲،۴۰۸ نے ہندی، ۵۰۰ نے پنجابی اور ۸۶۲ نے انگریزی میں جوابات دیئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی چار جماعتوں میں اس وقت ۱،۴۸۰ طلبا اردو، ۱۲۰ ہندی اور ۳۴۴ پنجابی پڑھتے ہیں۔ ایف سی کالج میں ۶۰۵ طلبہ اُردو، ۲۵۴ طلبہ ہندی اور ۱۰۰ طلبہ پنجابی پڑھتے ہیں۔ پہلے کالج میں مسلمانوں کی تعداد چالیس فی صدی ہے۔ دوسرے کالج میں مسلمان تیس فی صدی سے بھی کم ہیں اور سالِ اوّل میں جس میں تقریباً [illegible] طلبہ ہیں ۷۷ طلبہ اُردو پڑھتے ہیں جن میں صرف ۴۴ کے قریب مسلمان ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں یونیورسٹی کے ایف اے کے امتحان میں ۲،۹۵۴ طلبہ نے اُردو لی اور ۲۱۰ نے ہندی اور پنجابی۔ اور بی اے میں ۱۱۹۹ نے اُردو لی اور ۶۷۷ نے ہندی اور پنجابی۔ گویا پنجاب میں کالج کے طلبہ میں سے تقریباً ۶۵ فی صدی اُردو پڑھتے ہیں اور ۳۴ فی صدی ہندی اور پنجابی۔ اس سے پنجاب میں اردو کی مقبولیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ راقم کو ذاتی طور پر علم ہے کہ اردو کی حمایت میں جو اخبار "نوائے وقت" لاہور سے گزشتہ سال شائع ہونا شروع ہوا ہے اُس کا سارا عملہ ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جنہیں دوڑ دھوپ کر کے اپنی روٹی کمانی پڑتی ہے لیکن جو اس حالت میں بھی اپنی جیب سے کچھ صرف کر کے اخبار کو چلاتے ہیں اور کلرکوں اور چپراسیوں کا کام کرنے میں لطف اُٹھاتے ہیں۔ ایسے کئی اُردو کے عاشق ملک کے طول و عرض میں پھیلے پڑے ہیں، بعض نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اس بارے میں محض بعض لوگوں کی کوششیں قطعاً ناکافی ہیں۔ اُردو کے کئی کام اس وقت ادھورے پڑے ہیں اس کی ضروریات روز افزوں ہیں۔ اُدھر مخالفین کا پروپگنڈا اور اس سے زیادہ اُن کا کام روز و شب گھر گھر میں جاری ہے۔ پنجاب میں ہندو اور سکھ مذہب کا نام لے کر ہندوؤں اور سکھوں کو ہندی اور گورمکھی کی طرفداری اور اُردو کی مخالفت پر اُبھارا جا رہا ہے۔ اُردو والے لمبی تانے سو رہے ہیں کہ خیر اُردو یہاں کی مسلمہ سرکاری زبان ہے اور اپنی جگہ پر خوب قائم ہے۔ یہ اطمینان اور یہ غفلت محض ایک فاش غلطی نہیں بلکہ ایک شدید قومی گناہ ہے۔

بات یہ ہے کہ اُردو بہت کچھ ہے اور اہلِ اُردو نے اُس کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن اُردو کی ہمہ گیر حیثیت ایسی ہے اور مقابلے اور جدوجہد کا وہ زمانہ جس میں سے ہم گزر رہے ہیں ہمیں صاف صاف بتا سمجھا رہا ہے کہ اُردو کو ابھی بہت کچھ اور ہونا ہے اور اس لئے اُردو والوں کا محض "یہ ہماری زبان ہے پیارے" کہہ کر سر دُھننا اور بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں بلکہ ہر شخص کو اپنی بساط کے بموجب اپنے اپنے حلقے میں کچھ نہ کچھ کرنا اور کرتے رہنا چاہیئے۔

اُردو زبان کا مسئلہ کیا ہے؛ اُردو کی ضروریات کیا کیا ہیں؛ اور اُنہیں پورا کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے؛ جیسا کہ سر سپرو نے واضح کیا ہے اُردو کا مسئلہ ہماری تہذیب اور ہمارے ملکی و قومی اتحاد کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم اپنی مشترکہ تہذیب کو کھو بیٹھیں گے تو نئی مصنوعی فضا میں ہمارا دم گھٹنے لگے گا، اگر ہندو مسلم اتحاد کی نشانی مٹ جائے گی تو ملکی زندگی کی رہی سہی یکسانیت بھی اس کے ساتھ ہی برباد ہو جائے گی۔ **اُردو کی ضروریات** ایسی ہی ہیں جیسی کسی زبان کی ہو سکتی ہیں۔ زبان کو اپنے ماحول اور وقتی ضروریات کے مطابق ہونا چاہیئے اور اُس کے ادب کو جیتی جاگتی زندگی سے ایک زندہ تعلق قائم رکھنا چاہیئے ورنہ وہ عجائب گھر کی سی ایک نمائشی چیز ہو کر رہ جائے گا۔ زندگی سے یہ تعلق اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب کہ اندرونی ترقی کے ساتھ ساتھ بیرونی اشاعت بھی ہوتی رہے۔ اس لئے اس وقت ہمارے سامنے دو مسئلے ہیں: اُردو زبان و ادب کی ترقی اور اُردو زبان و ادب کی اشاعت۔

پہلے خود زبان کے **لسانی و ادبی مسائل** کا معاملہ ہے۔ اس کے متعلق انجمن ترقی اُردو نے ایک ادبی کمیٹی مقرر کی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کمیٹی جلد از جلد بعض ضروری باتوں کو طے کرے گی۔ خطی و طباعتی مسائل بھی کم ضروری نہیں ان کے تحت میں اعراب اور ٹائپ وغیرہ کے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ٹائپ کا مسئلہ اتنا

اہم اور فوری توجہ کے قابل ہے کہ اب مرکزی انجمن کو اس کے متعلق جلد کسی فیصلے پر پہنچنا چاہئیے۔ اعلےٰ درجے کے نستعلیق ٹائپ کی خواہش اور مزید جستجو تضییعِ اوقات کا موجب ہوگی۔ معلوم ہوا ہے کہ انجمن نے ایک عمدہ نستعلیق ٹائپ وضع کیا ہے۔ **اُردو دانی** کے لئے آسان کتابوں کی ضرورت روز بروز پوری ہو رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس پر بھی اصرار کرنا چاہئیے کہ ہمارے نوجوان یا ادیب زبان کو مسخ نہ کریں یعنی بقولِ شخصے نہ اُن کی اُردو "گورے شاہی" ہو جیسے "ڈیر کیا کہیں ہم تو اچھے ہیں البتہ پچھلے مہینے ہماری وائف کا ڈیتھ ہوگیا ہے"۔ اور نہ ایسی ادیبانہ و مولویانہ جیسے "بے شک آپ وہی شجرِ معلوم ہیں جس کی آبیاری کی اجازت معلم الملکوت نے ربِ کعبہ سے روزِ الست ہی سے لی تھی" یا جیسے ایک حیدرآبادی دفتر کا یہ نمونہ "بحوالہ مثل نشان ..... بمقدمہ خسرو پی زہر برائے خورانیدن و کشتنِ سگ ہائے بازاری بسلسلہ آمدِ مہمان"۔ سنسکرتی ہندی اور اکھوا ہندوستانی کی طرح یہ معرب و مفرس اُردو بھی ترقیٔ اُردو کے حق میں زہرِ قاتل کا اثر رکھتی ہے۔ اُردو کس طرح پڑھائی جائے اِس کی طرف ٹریننگ کالج علی گڑھ نے توجہ کرکے اُردو کو تدریسی مضامین میں داخل کیا ہے۔ **درسِ اُردو** کی ہدایات اگر ایک کتابی صورت میں پیش کی جائیں تو مفید ثابت ہوں گی۔ مرکزی انجمن **اصطلاحات پر نظرِ ثانی** کرکے انہیں شائع کر رہی ہے اور "سائنس" کا سہ ماہی رسالہ جنوری ۱۹۴۱ء سے ایک ماہوار رسالے کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ ہمارے ادب میں دو جدید قسموں کا اضافہ ہوا ہے رُومانیت اور ترقی پسند ادب۔ نفسیاتِ جنسی کا ایک نیا تصور سامنے آگیا ہے اور طبقۂ ادنیٰ سے واسطہ پیدا کرنے کی اُمنگ اُبھر رہی ہے، کیونکہ "ادب کا تناور درخت اپنی جڑوں کی آبیاری کے لئے عوام کنے ماغوں کا محتاج ہے اور اس لئے عام زندگی سے ادب کو الگ نہیں کیا جا سکتا"۔ ادب کو اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن نری بغاوت اور نعرے نہ زندگی کے لئے مفید ہو سکتے ہیں نہ ادب کے لئے، اور مسخ اور بندھے ٹکے الفاظ خواہ وہ ایمان و اعتقاد سے متعلق ہوں یا تغیر و انقلاب سے کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ اِس کے لئے مثالیت اور تخیل کی ضرورت ہے اور صحیح آفرینش کے نصب العین کی اور حرکت و عمل کی۔ اُردو مختصر افسانے کے جدید میلانات کے متعلق ایک نقاد کی رائے ہے کہ اِس میں "تعمیریت کی کمی ہے ہر شخص جھلّا یا ہُوا سا معلوم ہوتا ہے سنجیدگی اور بے تعصبی نہیں، صرف حیاتِ جنسی ہی ساری زندگی نہیں ہوتی۔ اِس میں اعتدال کی ضرورت ہے"۔ ترقی پسند مصنفین خوش ہیں کہ "پورے ہندوستانی ادب کا رُخ سماجی زندگی کی سمت ہوگیا ہے" لیکن اُن کے بعض بلند نظر رہنماؤں کو اس کا بھی احساس ہے کہ "وہ بے راہ روی اور مزاجی **رومانیت** ضرور نقصان دہ ہے جو ہمارے بعض نئے ادیبوں پر چھائی ہوئی ہے اور جو نہ ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کے خوگر ہیں نہ زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھتے ہیں"۔ "**ترقی پسند ادب** کی پہلی شرط حقائقِ زندگی کا ایسا مطالعہ ہے جس کی بنیاد قوتِ عمل پر ہو۔ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوکر سرمایہ دار اور زمیندار کو گالیاں دینے اور گونگی بہری چٹانوں کو انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نعرے سنانے سے ممکن ہے ذوقِ گفتار کی تسکین ہو جائے لیکن ترقی پسند ادب کی خدمت نہیں ہوتی" (نیا ادب اور کلیم نومبر ۱۹۴۰ء)۔ نئی قسم کی "بے قافیہ یا نیم وزنی نظمیں باعثِ مسرت ثابت ہو سکتی ہیں بشرطیکہ اُن میں کوئی نئی صوتی یا معنوی خوبیاں ہوں جو صرف کبھی کبھی دیکھنے میں آتی ہیں"۔ "**اُردو ادبیات کی تجدید**" کے عنوان سے ایک مفید مضمون اگست ۱۹۴۰ء کے ہمایوں میں شائع ہُوا ہے جس میں توجہ دلائی گئی ہے کہ اُردو میں عربی فارسی کے ثقیل الفاظ اور زبان و محاورہ اور علامات و اعراب کی غلطیوں سے پرہیز کرنا چاہئیے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ ہمارے ہاں بلند پایہ علمی و تنقیدی مضامین کی کمی ہے کیونکہ تنقیدی مضامین میں یا مغربی مصنفین کے اقوال کی بھرمار ہوتی ہے یا جانبداری کا مظاہرہ۔ غزل گوئی کی زیادتی ہے۔ فن برائے فن کا نیا نظریہ ہمارے ادب کو اخلاقیات اور زندگی سے علیحدہ کرنا چاہتا

ہے جو یقیناً ادب و زندگی دونوں کے لئے تباہ کن ہے۔ ہمارے ملک میں صحیح ادبی زندگی بسر کرنا دشوار کام ہے اور مصنف کو کافی داد نہیں ملتی۔ بعض تاجرین و ناشرین کی خود غرضی کی وجہ سے کتابوں کی قیمت جتنی کم ہونی چاہئے نہیں ہوتی قلیل الاشاعت رسالوں کی بھرمار ہے۔ رشیا بیات و ادبِ لطیف کی ستم کاریاں ہیں اور قارئین کے مذاق کو سلجھانے کی سخت ضرورت ہے۔

زبان و ادب کی اشاعت کا مسئلہ آج کل بہت اہم ہوگیا ہے۔ یہ پروپگنڈا کا زمانہ ہے اور ہم پروپگنڈا سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنی زبان و ادب کو محض چند خواص کی تفریحِ طبع کے لئے وقف نہیں کر سکتے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ہمارا فرض ہے اور اس فرض کا احساس روز بروز زیادہ ہونا چاہئے کہ ہم عوام کو علم و فن سے مستفید ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع دیں۔ اس لئے نرے ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے کام نہ چلے گا، اُردو پڑھنے والوں کی تعداد کو بڑھانا چاہئے۔ شہروں کے کوچے کوچے میں گاؤں کی گلی گلی میں بلکہ ہر سکول اور کالج اور ہر گھر میں اہلِ اُردو کو **تعلیمِ بالغاں** کا کام بڑے شد و مد سے شروع کر دینا چاہئے۔ اگر بعض لوگ فرقہ وارانہ پرچار سے متاثر ہو کر اُردو کو ترک کر دیں تو پروا نہیں لیکن اگر ہم خود اپنے ہم خیال لوگوں کو جلد سے جلد ایک وسیع پیمانے پر اُردو پڑھنے لکھنے کے قابل نہ بنا دیں گے تو باوجود بیسیوں خوبیوں کے اُردو زبان دوسروں کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ جائے گی۔ یہ ہے وہ بات جو آج زبان کے مسئلے میں سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اُردو کے ہر بہی خواہ کو اسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں نوکروں کو اُردو پڑھانے کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ لاہور کے بعض کالجوں میں بھی یہ کام ہو رہا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گزشتہ سال تعلیمِ بالغاں کے لئے ایک مفید رسالہ "دوست" اُردو میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ چونکہ بالغوں کی ذہنیت بچوں سے مختلف ہوتی ہے اس لئے اُن کے واسطے مختلف قسم کی ابتدائی کتابوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بالغوں کی تعلیم کے متعلق پنجاب میں نورالتعلیم کا تعلیمِ بالغاں نمبر ۳۹ء میں شائع ہو کر مفید ثابت ہوا ہے۔ اُردو کی تعلیم ہر طرف پھیل رہی ہے اور جتنی پھیل رہی ہے اُس سے بہت زیادہ پھیلائی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے اجتماعی سرمائے کی تو ضرورت ہے ہی لیکن یقیناً اس سے زیادہ ذاتی ایثار کی ضرورت ہے۔ اگر ہر شخص سال میں کم از کم ایک شخص کو اُردو پڑھانے کا تہیہ کر لے اور ایک اَور معمولی پڑھے ہوئے کو اخبار پڑھ سکنے کے قابل بنا دے تو تھوڑے عرصے میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ پنجاب کے بالغ دیہاتیوں کو اُردو پڑھنے کی ترغیب آسانی سے دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مشرقی بنگال کے بہت سے دیہاتی "نبی جی کی جُبان" سیکھنے سے دریغ نہ کریں گے۔ مگر ایسے کام تبھی ہو سکتے ہیں کہ ہمارے نوجوان قومی خدمت کے شوق کو دل میں جگہ دیں اور پھر گھر میں اور گھر سے باہر ہر روز اپنے اِس شوق کی دُھن میں کچھ نہ کچھ عملی کام کرتے رہیں۔

اُردو کے "چند بہی خواہوں" نے "ہماری زبان" کے ذریعے سے **اُردو والوں سے درخواست** کی ہے کہ "اُردو کے رواج کو اَور زیادہ عام کرنے کے لئے جہاں ہر قسم کی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں وہاں ساتھ ہی ہر اُردو دان کا فرض ہے کہ وہ اُردو کے وقار کو بلند رکھنے کے لئے بظاہر معمولی باتوں کا خیال رکھے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نہ صرف عام ملاقاتوں میں اُردو بولی جائے بلکہ خانگی اور کاروباری تحریر اُردو میں کی جائے۔ ناموں کی تختیاں، ملاقاتی کارڈ، دعوتی رقعے، لفافوں کے پتے، کاروباری رُودادیں، دُکانوں کے ناموں کے تختے سب اُردو میں ہوں۔ اگر انگریزی کا استعمال ضروری ہے تو اُردو کے ساتھ انگریزی کا استعمال ہونا چاہئے۔ ہر حال میں اُردو زبان کو ترجیح دینی چاہئے۔ اس وقت سوال صرف عزت حمیت، قومی وقار اور ہماری زبان کی حفاظت اور توسیع کا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جب تک خود اُردو دان اُردو کی عزت نہیں

کریں گے غیر اُردو داں اُس کی اہمیت کو کبھی نہیں پہچان سکیں گے"۔

پروفیسر نجیب اشرف نے بھی ایک اپیل اسی مضمون کی شائع کی ہے جس میں ان باتوں پر بھی زور دیا ہے کہ محکمہ ریڈیو کو برابر خط لکھے جائیں کہ اُردو کا پروگرام زیادہ سے زیادہ ہو۔ منی آرڈر اور رجسٹری کے اُردو فارم طلب کئے جائیں اور اُردو ہی میں ان پر پتے لکھے جائیں۔ سینما وغیرہ کے اشتہارات میں اُردو کی شمولیت کا بھی مطالبہ کیا جائے۔ تجارتی خطوط پر اُردو میں بھی پتے چھاپے جائیں۔ اپنے شہر کی سڑکوں اور ریلوے سٹیشن اور ریل کے اعلانات اور ٹکٹوں پر اُردو کے استعمال کا مطالبہ کیا جائے۔ جہاں اُردو کے مدارس نہیں ہیں، وہاں ان کی تحریک کی جائے اور آئندہ مردم شماری کے موقع پر یہ کوشش کی جائے کہ ہر شخص اپنی مادری زبان اُردو لکھائے۔

۱۹۴۱ء کی **مردم شماری** کے متعلق مختلف جماعتیں کوشش کر رہی ہیں کہ ان کی تعداد اور اُن کی زبان بولنے والوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ لکھوائی جائے۔ لہٰذا اس امر میں اُردو والوں کو بھی چوکنا ہو جانا چاہیئے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں صرف مشرقی اور مغربی ہندی کا ذکر کیا گیا ہے گویا اُردو کوئی زبان ہی نہیں۔ اس دفعہ منظم طور پر یہ کوشش کی جائے کہ جو لوگ اُردو بولتے یا اُردو میں لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ وہ اپنی زبان اُردو ہی لکھوائیں۔ آج کل کی زندگی اس قدر پیچیدہ ہو گئی ہے کہ اُس شخص یا جماعت کو جو صحیح معنوں میں زندہ رہنا چاہے بہت سے امُور کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اِس سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ جب زندگی ایسی ہے جیسی کہ وہ ہے تو ہمیں اپنے عمل کو اُس کی وقتی ضروریات کے مطابق ڈھالنا چاہیئے۔ ہاں اتنا خیال رہے کہ جہاں تک ہو سکے راستی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

اُردو کا مسئلہ بدقسمتی سے ایک سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم یہ یقین رکھتے ہوئے کہ "ملا دے گی ضرورت ایک دن ہندو مسلماں کو" بغیر کسی کو نقصان پہنچائے ہندو مسلم اتحاد کے نشان کو بلند کئے رکھیں۔

اخیر میں ہم سر سپرو کا ایک قول پھر دُہراتے ہیں کہ "اگر وہ لوگ جن کو اُردو سے دلچسپی ہے اور جو اُردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں اپنی کوشش میں کوتاہی نہ کریں گے تو باوجود اُن حملوں کے جو عملی طور پر اس زبان پر اس وقت ہو رہے ہیں اس کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں گے بلکہ اس کی توسیع بھی کر سکیں گے!"

اُردو والے یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن کوشش شرط ہے — مُسلسل اور منظّم کوشش!

بشیر احمدؐ

اُردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے — دُنیا کی ہر زبان سے پیاری زبان ہے

اُردو ہی دوستو! وطنیت کی جان ہے — یہ یاد رکھو اس سے اُخوت کی شان ہے

کیفی

جہاں نما

۱۹۴۰ء کے اہم واقعات

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ممالک
۳؍ جنوری		جرمنی نے رُوس کی امداد کے لئے فن لینڈ میں اپنا فوجی مشن بھیجا۔
۱۰؍ 〃	بمبئی میں وائسرائے کی تقریر کہ ہندوستان کو جلد سے جلد نوآبادیات کا درجہ عطا کیا جائے گا۔	
۲۳؍ 〃	مسٹر جناح نے گورنمنٹ کو متنبہ کیا کہ وہ مسلم حقوق کو نظر انداز نہ کرے۔	
۹؍ فروری		ممالکِ متحدہ (امریکہ) نے اپنا صلح کا مشن یورپ میں بھیجا۔
۱۶؍ 〃	مولانا ابوالکلام آزاد کانگرس کے صدر منتخب ہوئے۔	
۲۵؍ 〃	مسٹر محمد علی جناح مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔	
۱۲؍ مارچ	ہندوستانی ریاستوں کا متحدہ مطالبہ کہ ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دیا جائے	فن لینڈ نے ہار مان کر روس سے صلح کر لی اور تھوڑا سا علاقہ اُسے دے دیا۔
۱۷ تا ۲۱؍ 〃	رام گڑھ میں کانگرس کا ترپنواں (۵۳) سالانہ اجلاس	
۱۹؍ 〃	لاہور میں حکومت نے خاکساروں پر گولی چلائی۔	
۲۲ تا ۲۴؍ 〃	لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس (پاکستان کی قرارداد منظور کی گئی)	
۹؍ اپریل		جرمنی نے ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کر دیا۔
۱۴؍ 〃	پاکستان کے خلاف ہندوؤں اور سکھوں کی شورش۔	
۴؍ مئی		جنوبی ناروے سے اتحادیوں کی ناکام مراجعت۔ جرمنی نے ہالینڈ اور بلجیم پر دھاوا بول دیا۔
۱۰؍ 〃		انگلستان میں چرچل وزیرِ اعظم بنایا گیا۔
۱۵؍ 〃		ہالینڈ نے ہتھیار ڈال دیئے۔
۲۲؍ 〃	لاہور میں مسلمانوں نے خاکساروں سے ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے ہڑتال کی۔	
۲۳؍ 〃	دارالعوام میں وزیرِ ہند کا بیان کہ ہندوستان کو آخر کار برطانوی سلطنت میں مساوات کا درجہ دیا جائے گا۔	
۲۸؍ 〃		بلجیم نے ہتھیار ڈال دیئے۔
۳؍ جون		جرمنی نے دریائے انگلستان کی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ممالک
۱۱ جون		اٹلی نے اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔
۱۳ //		جرمن پیرس میں داخل ہوئے
۱۸ //		انگلستان پر روزانہ ہوائی حملے شروع ہوئے۔
۲۱ //	کانگرسی مجلسِ عاملہ نے گاندھی جی کو کانگرسی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا۔	
۲۲ //		فرانس نے جرمنی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔
۲۳ //		مفرور فرانسیسی جرنیل ڈی گال نے لندن میں عارضی فرانسیسی حکومت قائم کی۔
۲۹ //		رُوس نے رومانیا کی سرحد پار کر کے بیسربیا کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔
		جاپان نے مشرقِ اقصٰی پر اپنا "منروی" اصول عائد کرنے کا اعلان کیا۔
		انگلستان نے فرانسیسی بیڑے پر زبردستی قبضہ کر لیا۔
۳ جولائی	گاندھی کی "اپیل ہر برطانوی سے"	
۷ //	کانگرسی مجلسِ عاملہ نے ہندوستان کی مکمل آزادی کے اعلان کا مطالبہ کیا	
۱۱ //		ڈی ویلرا جمہوریہ آئرلینڈ کے صدر نے انگلستان سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔
۱۵ //		چرچل نے انگریزوں سے ایک طویل جنگ کے لئے تیاری کرنے کی اپیل کی۔
۱۸ //		برما روڈ کے بند کرنے کے متعلق انگلستان اور جاپان میں سمجھوتا
۱۹ //		ہٹلر نے انگلستان کو اپنی صُلح کا پیغام دیا۔
۲۱ //		لٹویا استھونیا اور لتھونیا تینوں بالٹکی ملک رُوس کی مملکت میں شامل ہوئے۔
۲۲ //		کُل امریکی کانفرنس کا انعقاد
۲۳ //		انگلستان نے ہٹلر کا پیغامِ صلح ٹھکرا دیا۔
۳۰/۳۱ //	پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں مزدوروں کی کُل ہند ریاستی کانفرنس	انگلستان پر جرمن حملے کی افواہیں + ترکی میں زلزلہ
۴ اگست	گاندھی نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر حالات بہتر نہ ہوئے تو وہ ستیہ گرہ شروع کر دیں گے۔	
۸ // //	موجودہ کونسل کی توسیع، جنگی بورڈ کے قیام اور جنگ کے بعد مزید اصلاحات کے متعلق وائسرائے کا اہم بیان	اٹلی نے صومالی لینڈ پر حملہ کر دیا
		رُو دبارِ انگلستان پر ہوائی جنگ جو ۱۴ گھنٹے جاری رہی۔
۱۰ //		انگریزی فوجیں چین سے ہٹالی گئیں۔
۱۵ //		ایک ہزار جرمن ہوائی جہازوں کا حملہ انگلستان پر

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ممالک
۱۶ر اگست		انگریزی ہوائی بیڑے کا جوابی حملہ جرمنی پر
۱۹ر ۔		ممالک متحدہ امریکہ اور کینیڈا کی مشترکہ محافظت کی تدابیر برطانیہ نے سمالی لینڈ خالی کر دیا۔
۲۱ر ۔		رُومانیہ نے بلغاریہ کو ڈبروڈجا کا علاقہ دے دیا۔
۲۲ر ۔	کانگرس نے وائسرائے کی مراعات منظور کرنے سے انکار کر دیا	مشہور طبیعیات و رُوحانیات داں سر آلیور لاج کا انتقال
۳۰ر ۔		رُومانیا ہنگری کو اپنا ٹرانسلوینیا کا بیشتر علاقہ دینے پر مجبور ہُوا۔
۲ر ستمبر	مُسلم لیگ نے وائسرائے کے بیان پر اظہارِ پسندیدگی کیا لیکن بعض امُور کی وضاحت چاہی۔	
۳ر ۔		امریکہ اور انگلستان کے درمیان مفاہمت جس کے مطابق بعض "مقامات" کے عوض میں امریکہ نے پچاس تباہ کن جہاز دیئے
۵ر ۔	وزیرِ ہند نے کانگرس کا مطالبہ رد کر دیا	
۱۵ر ۔	کانگرس نے گاندھی کو اپنا امیر تسلیم کرکے حکومت سے آزادیٔ رائے اور شہری آزادی کا مطالبہ کیا	اطالیہ نے مصر پر حملہ کر دیا۔
۲۲ر ۔		جاپان کے انڈوچائنا پر حملہ آور ہوتے ہی فرانسیسی حکومت نے جاپانی شرائط مان لیں۔
۲۴ر ۔	جناح کی ملاقات وائسرائے سے	فرانسیسی مغربی افریقہ میں ڈی گال کو شکست
۲۵ر ۔	وزیرِ ہند کی تقریر کہ ہندُستانی خود آپس میں سمجھوتا کرکے ہندُستان کا مسئلہ طے کریں	
۲۷ر ۔	گاندھی کی ملاقات وائسرائے سے	جرمنی اطالیہ اور جاپان کے درمیان دس سالہ معاہدہ
۲۸ر ۔	مُسلم لیگ نے وائسرائے کی مراعات لینے سے انکار کر دیا۔	
۸ر اکتوبر		انگلستان نے برما روڈ کو پھر کھول دینے کا فیصلہ کیا۔
۱۲ر ۔		رُوزولٹ صدرِ امریکہ کی ریڈیو تقریر کہ امریکہ برابر انگلستان کی مدد کرتا رہے گا۔
۱۳ر ۔		جاپان کی جارحانہ کارروائی چین میں
۱۴ر ۔		جرمنی نے رُومانیا میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔
۱۷ر ۔	گاندھی نے انفرادی سول نافرمانی شروع کر دی۔ بھاوے کی تقریر	
۲۱ر ۔	بھاوے کی گرفتاری	جرمنی اور یوگوسلاویا کے درمیان تجارتی معاہدہ
۲۴ر ۔		روزولٹ کی تقریر کہ امریکہ جنگ میں شریک ہوگا۔
۲۵ر ۔	برطانوی سلطنت کے مشرقی ممالک کی کانفرنس دہلی میں از جنگی امداد کے متعلق شروع	
۲۶ر ۔		فرانسیسی مارشل پیتاں اور ہٹلر کے درمیان اتحادِ عمل کے متعلق گفتگو
۲۸ر ۔		اٹلی نے یونان پر حملہ کر دیا

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ممالک
۳۱ر اکتوبر:	جواہرلال نہرو کی گرفتاری	
یکم نومبر:		ترکی کے صدر جمہوریہ کا اعلان کہ ترکی جنگ سے علیحدہ رہے گا۔
۶ر ״ :		رُوزولٹ تیسری بار امریکہ کا صدر منتخب ہُوا۔
۹ر ״ :		امریکہ کا انگلستان کو مزید امداد دینے کا وعدہ
۱۰ر ״ :	اخبارات کی کانفرنس دہلی میں	ترکوں نے کمال پاشا کی دُوسری برسی پر حلف اُٹھایا کہ وہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جانیں لڑا دیں گے۔
۱۲ر ״ :		مولوٹاف کی ملاقات ہٹلر سے۔ روزولٹ کی تقریر آمرین کے خلاف۔
۱۳ر ״ :		انگلستان کے بیڑے نے اطالوی بیڑے کو شدید نقصان پہنچایا۔ یونانیوں نے اطالویوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کردی۔
۱۴ر ״ :		جرمنوں نے ہوائی بمباری سے انگریزی شہر کوونٹری کو برباد کردیا
۱۹ر ״ :	کانگرس پارٹی کی کوشش سے مرکزی اسمبلی میں فنانس بل مسترد ہوگیا۔	
۲۰ر ״ :	وائسرائے اور وزیرِ ہند کی تقریریں۔ کانگرس کو جواب و تنبیہ	ہنگری "محوری" طاقتوں میں شامل ہوگیا۔
۲۳ر ״ :	جناح کی تقریر کہ مسلمان طاقت میں حصّہ چاہتے ہیں اور پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں	رُومانیا بھی "محوری" طاقتوں میں شامل ہوگیا۔ برطانوی سفیر نے امریکہ سے سامانِ جنگ اور مالی امداد کی
۲۴ر ״ :		پوپ نے قیامِ امن کے لئے ایک ہفتہ روزہ رکھنے کا ارادہ کیا۔
۳۰ر ״ :	جناح کی تقریر کہ مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں حسبِ ضرورت مداخلت کریں گے	جاپان نے ننکن کی ریاکار حکومت کو چین کی باقاعدہ حکومت مان لیا۔
یکم دسمبر:	ستیہ گرہیوں کی گرفتاریاں لاہور میں تحریکِ پاکستان کے خلاف کانفرنس	
۲ر ״ :		ورسائی فرانس کا دار السلطنت بنایا گیا۔ ہٹلر نے لورین کا علاقہ جرمنی میں شامل کرلیا۔
۵ر ״ :		جرمنی اور رومانیا کے درمیان دس سالہ معاہدہ
۹ر ״ :		جاپانی پالیسی کا اعلان کہ اگر امریکہ جنگ میں شریک ہوگا تو جاپان جرمنی کا ساتھ دے گا۔
۱۰ر ״ :		مصری محاذ پر اطالویوں کے خلاف برطانوی فوجوں کی کامیاب جارحانہ پیش قدمی
۱۲ر ״ :	وزیرِ ہند کی تقریر کہ سب جماعتوں کو خود غرضانہ منصوبے ترک کرکے "ہندستان پہلے" کا نعرہ بلند کرنا چاہئے۔	
۱۳ر ״ :	سر سپرو کی اپیل گاندھی جناح اور حکومتِ ہند سے کہ وہ سب فوراً متحد ہوکر ایک قومی حکومت قائم کریں۔	
۱۶ر ״ :	وائسرائے کی تقریر کہ ہند کے لئے درجۂ نوآبادیات اب بھی حکومت کا نصب العین ہے۔	

یورپ کی دوسری عالمگیر جنگ جو یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی ۱۹۴۰ء میں بدستور جاری ہی۔ کہا گیا ہے کہ اس دوسری جنگ کا بیج بھی گویا پہلی جنگِ عالمگیر (۱۸-۱۹۱۴ء) یا صلح نامۂ ورسائی (۱۹۱۹ء) نے بویا۔ لڑائی سے لڑائی پیدا ہوتی ہے اور نفرت سے نفرت اور سخت گیر صلح کا لازم نتیجہ ایک اور تباہ کن جنگ ہوتا ہے۔ ورسائی میں جرمنی کے بعض علاقے اُس سے چھین لئے گئے اور اُس کے گناہوں کی پاداش میں اُس پر بھاری تاوان لگایا گیا۔ پھر لوکارنو (۱۹۲۵ء) اور برانڈ کیلاگ (۱۹۲۸ء) کے معاہدوں سے اِن زخموں کی مرہم پٹی کی گئی لیکن ۱۹۲۹ء کی معاشی سرد بازاری نے مندمل زخم کو پھر ہرا کر دیا اور گو ۱۹۳۲ء میں تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس میں کچھ قوموں کو ملانے کی کوشش ہوئی مگر محروم شدہ قومیں لیگِ اقوام میں "اتحادیوں" کا خودغرضانہ تسلط دیکھ کر غم و غصہ سے بے تاب ہو گئیں اور محفلِ تہذیب کو چھوڑ کر اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ گانے لگیں۔ اِدھر اتحادی بھی کچھ ایک دوسرے سے بدگمان تھے کچھ اپنے مال متاع میں مگن۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ مل کر کام کر سکے اور نہ مل کر غاصبوں کی روک تھام کر سکے۔ جاپان نے منچوریا سنبھال لیا (۱۹۳۱ء)۔ اٹلی نے ابی سینیا پر ہاتھ صاف کیا (۱۹۳۵ء) جرمنی نے پہلے رائین لینڈ (۱۹۳۶ء) اور پھر آسٹریا اور سوڈیٹن لینڈ (۱۹۳۸ء) اور چیکوسلوویکیا اور میمل (۱۹۳۹ء) کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ساتھ ہی اٹلی نے البانیہ پر چھاپا مارا (اپریل ۱۹۳۹ء)۔ اُدھر (۱۹۳۶ء سے) سپین میں خانہ جنگی شروع تھی اور (۱۹۳۷ء سے) جاپان چین کی گردن پر سوار ہو رہا تھا۔ بین الاقوامی قانون محض نام کو باقی تھا۔ کوئی کسی کو پوچھنے یا روکنے والا نہ تھا۔ اِدھر سے محض اخباری یا اخلاقی اعتراضات ہوتے تھے جس کا اُدھر سے بڑی دیدہ دلیری سے جواب دیا جاتا تھا کہ حضرت "تم روا رکھتے تھے کل تک ہم روا رکھتے ہیں آج"۔ جرمنی اور اٹلی اور جاپان صاف صاف کہتے تھے کہ انگلستان اور فرانس نے آدھی دُنیا سنبھال رکھی ہے اب جو کچھ تھوڑا بہت بچا کھچا موجود ہے اس سے ہمیں کیوں باز رکھتے ہیں؟ اور یوں یہ چھین جھپٹ جاری رہی یہاں تک کہ جرمنی نے اندر ہی اندر رُوس سے جو جمہوریت پسند طاقتوں کی بے اعتنائی سے بیزار ہو چکا تھا سمجھوتا کر کے پولینڈ سے اپنے چھنے ہوئے شہر ڈینزگ کا مطالبہ کیا اور خاطر خواہ جواب نہ ملنے پر فوراً اُس پر حملہ کر دیا۔ اس طرح دوسری جنگِ عالمگیر کا آغاز ہوا۔

پہلی جنگ سے لے کر دوسری جنگ تک مہذب دُنیا ذلت کی دلدل میں دھنستی گئی۔ سائنس کی ترقی جاری تھی لیکن باوجود ہزار پند و نصائح کے اخلاقی ذمہ داری کا احساس نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ نوعِ انسان جہاں تھی وہیں رہی نسلی امتیاز، مذہبی عداوت، اپنے ملک پر فخر، دوسرے کے ملک سے نفرت، اپنی ثقافت پر شیخی، دوسروں کی شائستگی کی تضحیک، علم و فن کے حصول کے ساتھ ساتھ یہ صفاتِ حمیدہ بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی گئیں۔ ہر ایک نے اپنے آپ کو بالکل سچا اور دوسرے کو قطعاً جھوٹا سمجھا۔ نتیجہ ظاہر ہے پہلے جنگ نما صلح اور پھر خونی جنگ۔ ایک انگریز شاعر نے جنگِ عظیم کی بابت خوب لکھا کہ:۔

"لڑنے والی قومیں خدا کے حضور گاتی اور شور مچاتی ہیں
"خدا انگلستان کو تباہ کرے" "خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے"
"خدا یہ کرے" "خدا وہ کرے" اور "خدا وُوں بھی کر دے"
"خدا چلاّیا" خدایا! سو یہ ہیں وہ کام جو کرنے ہیں مجھے"۔

بے اصولی نے بیسیوں اصول اور اجتماعیت نے سینکڑوں جماعتیں پیدا کر دیں۔ قومیت تو پہلے ہی ستم ڈھا رہی تھی۔ اب اس کے ساتھ اور اس کے اندر سرمایہ داری کے خلاف اشتراکیت اور اشتمالیت اور جمہوریت کے خلاف فاشیت اور نازیت اُٹھ کھڑی ہوئیں اور تہذیب کے چولھے پر ایک عجیب و غریب کھچڑی پکنے لگی۔

لیکن باوجود ان نئی نویلی چیزوں کے ابھی تمدن کی محفل میں قومیت ہی کا دور ہے اور وہی ہے جس نے فطرت کی اس روشن دنیا میں اندھیر مچا رکھا ہے
انگلستان، جرمنی، روس، ممالکِ متحدہ، جاپان، (اور بزعمِ خود) اٹلی یہ ہیں دنیا کی پانچ چھ بڑی طاقتیں اور اب ان کی کوشش یہی ہے کہ چھوٹی طاقتیں اگر
جئیں بھی تو ہمارے دم سے۔ انگلستان کا دعویٰ ہے کہ اس وقت زمین کا چوتھائی اور اس کی آبادی کا پانچواں حصہ میرے ساتھ ہے۔ جرمنی منادی کرتا ہے کہ
دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت میں ہوں اور اسی لئے میں کمال سلطنت سے محروم کر دیا گیا ہوں میں ہی یورپ اور اس کے ذریعے دنیا کی رہنمائی کا حق رکھتا ہوں
روس کو یقین ہے کہ دنیا بھر کی بےانصافیوں کا علاج اسی کی اشتمالی ارد کے اندر موجود ہے (یاد رہے کہ اس وقت روس میں بعض شخصوں کی آمدنی دوسروں سے
پانچ سو گنا زیادہ ہے)۔ ممالکِ متحدہ سمجھتا ہے کہ میری قومیت دراصل اس بین الاقوامیت کی تصویر ہے جس کی تمدن کو تلاش ہے۔ جاپان انگلستان کو ایشیا سے نکال
کر خود اس کی شہنشاہیت کی جگہ لینا چاہتا ہے۔ اٹلی رومۃ الکبریٰ کی عظمت کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ بیچاری چھوٹی قومیں ان لاٹھی چلانے والی بڑی بڑی متکبر قوموں کے
ڈر سے اس وقت گایوں بھینسوں کی طرح سہمی بیٹھی ہیں۔ اس حال میں بقول ایچ جی ویلز متمدن انسان ایک ایسے مدقوق شخص کی مانند ہے جس کی دق نہایت
تیزی سے اس کے جسم کو گھلا رہی ہے اور جو منشی مقویات کے سہارے زندگی کے رہے سہے دن گزار رہا ہے۔ اس کے برعکس جوڈ کا خیال ہے کہ لوگ کبھی
اتنے بیدار نہ تھے جتنے آج ہو چکے ہیں۔ وہ پوچھ رہے ہیں تو کیا؟ پچیس سال کے اندر پھر ایک اور عالمگیر جنگ؟ لوگ پوچھتے رہے، چلاّیا کئے لیکن جنگ آنی
تھی سو آئی!

موجودہ جنگ کے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ پچھلی جنگ سے ابھی اس کا موازنہ نہیں ہو سکتا لیکن اس ایک بات سے کہ انگلستان کا روزانہ جنگی خرچ
جو ۱۹۳۹ء کے اخیر میں نو کروڑ روپے کے قریب تھا ۱۹۴۰ء کے اخیر میں اکیس کروڑ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسانی تباہی کی رفتار پہلے کی نسبت
کتنی تیز ہو چکی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہونے کے ایک مہینے کے اندر پولینڈ کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر ۱۹۳۹ء کے آخری اور ۱۹۴۰ء کے پہلے تین مہینے خاموشی سے گزر گئے
لوگوں نے سوچا یہ لڑائی نہیں عجوبہ ہے۔ لیکن چھ ماہ کے بعد جنگی کل پھر حرکت میں آئی، ایسی حرکت جس نے ملکوں کے ملک متزلزل اور تہ و بالا کر دیئے۔ ڈنمارک، ناروے،
ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ، فرانس سب نے یکے بعد دیگرے جرمنی کی برق رفتار قوت کے آگے اپنے ہتھیار ڈال دیئے۔ فرانس کی آناً فاناً شکست نے ساری دنیا کو مبہوت
کر دیا۔ جرمنی نے نئے نئے جنگی آلات نکالے اور نئے نئے جنگی طریقے اختیار کئے۔ نیچے ہزاروں تیز چلنے والے ٹینک اور اوپر ہزاروں تیز اڑنے والے طیارے اپنی راہ میں حائل
ہونے والے تمام آلات اور اشیاء اور اشخاص کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے اور قیمہ کرتے چلے گئے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ مقابلہ کر سکتا۔ اس کے ساتھ ان کا لشکر کشی کا فن
ایسا حیرت انگیز تھا کہ اتحادیوں کے لاکھوں سپاہی باآسانی ان کے نرغے میں آ گئے۔ یوں "زبردست" فرانسیسی فوج پسپا ہو گئی۔ اب صرف انگلستان رہ
گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی چند دنوں میں اس موذی غنیم کا شکار ہو جائے گا۔ مگر انگلستان نے ایسی پامردی اور استقلال اور منظم ہمت سے کام لیا اور ایسا جان توڑ
مقابلہ کیا کہ دنیا آفرین کہہ اٹھی۔ جون کے وسط سے لے کر سال کے اخیر تک جرمن ہوابازوں نے لندن اور انگلستان کے کئی اور شہروں کو تباہ و برباد کر کے رکھ
دیا لیکن انگریزوں نے ہمت نہ ہاری۔ جرمن برسوں سے لڑائی کی تیاریاں کر رہے تھے انگلستان کے کوتاہ بین مدبرین اپنی عادت کے مطابق دیر میں جاگے مگر بمصداقِ دیر
آید درست آید آخر پوری طرح جاگ اٹھے اور ایک ایک انگریز اپنے جان و مال سے اپنے وطن کے آڑے آیا۔ لیکن ابھی مصیبتوں کا خاتمہ نہ ہوا تھا۔ اٹلی نے جنگ کا اعلان
کر دیا۔ روس پہلے رومانیا کے ایک حصے پر قابض ہو گیا۔ پھر اس نے بالٹک کی تینوں ریاستوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ رومانیا کے سر سے روس کی آفت ٹلی ہی تھی کہ اس

کی ٹانگ بلگیریا نے کھینچی اور بازوہنگری نے یہاں تک کہ وہ عاجز ہوکر جرمنی کے قدموں میں گر پڑا۔ ستمبر میں جرمنی اٹلی اور جاپان نے اپنے ایک دس سالہ "محوری" معاہدے کا اعلان کیا۔ فرانس کی شکست کے بعد جاپان پہلے ہی مشرق میں اپنے پنجے نکال چکا تھا۔ دباؤ پڑنے پر انگلستان نے اپنے برما روڈ کو بند کر دیا اور اپنے چینی مقبوضات کا کچھ حصہ خالی کر دیا۔ ساتھ ہی جاپان نے سیام اور انڈو چائنا کو دھمکی دے کر یہاں اپنے قدم جما لئے اور کہا کہ اگر ڈچ جزائر شرق الہند میں میرے معاشی مفاد کا لحاظ رکھا جائے گا تو میں حملہ نہ کروں گا۔ ادھر اٹلی یونان پر حملہ آور ہوا۔ ان بڑھتے ہوئے خطروں کو دیکھ کر امریکہ کو یقین ہو گیا کہ اگر وہ جوں کا توں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہے گا تو انگلستان کے خاتمے پر اُس کی باری بھی آئے گی۔ لہٰذا اُس نے انگلستان کی درخواست پر ہر طرح اُس کی مدد کرنی شروع کر دی اور کہا کہ سوائے جنگ میں شریک ہونے کے وہ حتی المقدور انگلستان کی پشت پناہ بنے گا۔ اس سے انگلستان کی ڈھارس بندھی۔ اُس نے مشرقِ وسطیٰ میں اٹلی کے خلاف پیش قدمی کی اور برطانیہ کی پھیلی ہوئی سلطنت کے کونے کونے سے جنگجو اور سامانِ جنگ لڑائی کے میدان میں آنا شروع ہو گیا۔ اس وقت مستقبل لاعلمی کی دھند میں چھپا ہوا ہے اور پیشین گوئی فضول ہے۔ دونوں فریق کم و بیش اپنی خود غرضی اور طاقت کے نشے میں چور ہیں اور خوب گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ جرمنی یورپ کے براعظم کو اپنی گرفت سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ انگلستان اس گرفت کو اپنے اور دوسری قوموں کے لئے موت کا پیغام سمجھتا ہے۔ روس یہ سماں دیکھ کر مطمئن ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سرمایہ دار طاقتیں خوب لڑ بھڑ کر ایک دوسرے کا خاتمہ کر دیں اور پھر وہ ایک تھکی ماندی دُنیا میں اشتراکیت کا علم بردار بن کر آ دھمکے۔

اِس خوفناک اور شرمناک جنگ کا تو جو انجام ہونا ہے وہ ہو گا لیکن سوال یہ ہے کہ نوعِ انسان کا انجام کیا ہو گا؛ کیا متمدن لوگ اسی طرح وقتاً فوقتاً درندوں کی طرح ایک دوسرے کی چیر پھاڑ کرتے رہیں گے؛ کیا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو گا؛ اِس جوع الارض، اِس بہیمیت اِس اخلاقی ذلت کی وجہ کیا ہے اور کیا اِس کا کوئی علاج بھی ہے؛ ہر وہ چیز جو تشدد کی خواہش کے کم کرنے میں مدد دے اس علاج میں داخل ہے۔ تشدد کی خواہش کیونکر کم ہو؛ یوں کہ انسان یہ سمجھنے لگیں کہ "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" ہم سب ایک ہیں، ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں، ایک کی سچی خوشی دوسرے کے اطمینان میں مضمر ہے۔ اِس کے لئے ایک نئے مذہب ایک نئی روحانیت اور ایک نئے اخلاق کی ضرورت ہے۔ کیا حالات خود بخود انسان کو اس مطلوبہ راہ پر لے جائیں گے؛ کیا کوئی نیا روحانی نظام دُنیا پر اپنا پرتو ڈالے گا؛ ہر متمدن شخص کا فرض ہے کہ ایسی آسمانی امداد کا انتظار کئے بغیر وہ موجودہ تاریکی کے ہوتے ہوئے اپنے اپنے حلقے میں آزادی اور باہمی محبت کی روشنی ڈالے۔

لیکن اِن انفرادی مساعی کے علاوہ دُنیا کو اِس وقت کسی نئی اجتماعی کوشش کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ صورتِ حالات کے بہت سے علاج تجویز کئے گئے ہیں اور کئی منصوبے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس جنگ کے بعد دُنیا وہ دُنیا نہ رہے گی جو اس سے پہلے تھی۔ آنے والی معاشی سربازاری کا رنگ پہلے کچھ اور ہو گا۔ علاوہ بریں انسانیت کی روح رجعت پسند قوتوں کے ظلم و ستم کے نیچے کراہ رہی ہے اور رہائی چاہتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یورپ یا یورپ اور امریکہ کا ایک متحدہ فیڈریشن بنا دیا جائے۔ یورپ کی معاشی خوشحالی کے لئے ایک مشترکہ فنڈ کھولا جائے۔ ایک بین الاقوامی معاشی حکومت قائم کی جائے جو متمدن قوموں کے لئے مساوی مواقع پیدا کرے۔ قوموں کو ہوائی جہازوں سے محروم کر کے صرف ایک بین الاقوامی ہوائی پولیس رکھی جائے۔ ایچ جی ویلز نے انسانی مشکلات کا حل ایک مثلث میں ڈھونڈ نکالا ہے جس کے تین ضلع اشتراکیت علم اور قانون ہوں گے۔ انسانی حقوق کا اعلان کیا جائے گا کہ ہر شخص صحت تعلیم آزادیٔ رائے معاش جان و مال کی حفاظت کا حق دار ہے۔ مفکر مذکور کو یقین ہے کہ دُنیا کا یہ نیا نظام آ کے رہے گا بلکہ آ رہا ہے اور بعض باتوں میں آ چکا ہے۔ انگلستان تک سے ملک کے اداروں میں اشتراکیت جھلک رہی ہے۔ امیر غریب کا فرق، شہنشاہیت، قومیت پرستی یہ کم ہو کے رہیں گی۔ جوڈ کہتا ہے کہ خود

انسان اتنا بُرا نہیں جتنی منظم جماعتیں بُری ہیں۔ اس کا وہ یہ علاج تجویز کرتا ہے کہ موجودہ ریاست یا مملکت کے بعض اختیارات مثلاً فوج تجارت مالیات نوآبادیات چھین کر ایک بین الاقوامی حکومت کو دے دیئے جائیں۔ زمانہ ایسے تغیر کے لئے آمادہ ہے۔ یہ سب کچھ سچ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کام کون کرے گا اور کیسے؟ اور جو لوگ یہ بات نہ مانیں گے اُنہیں کون منوائے گا؟

اصلاح و ترقی کی یہ سب تدابیر سوچتے ہوئے یورپ کے عقلمند اکثر بھول جاتے ہیں کہ ترقی یافتہ اور آزاد اور طاقتور قوموں کے علاوہ دُنیا میں کچھ پس ماندہ اور غلام اور کمزور قومیں بھی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی اور بھیانک مثال ہمارا بدقسمت ملک ہندوستان ہے۔ ۱۹۴۰ء میں اِس پر کیا گزری؟ برطانوی حکومت نے کہا ہٹلر کے خلاف جنگ تہذیب کے لئے جنگ ہے اور یہ کہہ کر وہ ہندوستان کو محاذِ جنگ کی طرف لے گئی۔ ہندوستان نے کہا ہم ہٹلر کی فتح نہیں چاہتے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی اُس آزادی کا کچھ مزا چکھایا جائے جس کے حصول کے لئے ہم اور آپ لڑ رہے ہیں۔ اس پر وائسرائے اور وزیرِ ہند نے سمجھایا بجھایا کہ یہ نازک وقت ایسے سخت مطالبات کے لئے موزوں نہیں اور یقین دلایا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو نوآبادیات کا درجہ عطا کیا جائے گا۔ اور ہندوستانیوں کی مرضی کے مطابق ایک ایسا دستور وضع کیا جائے گا جس میں انگلستان سمیت سب جماعتوں کے مفاد کا مناسب لحاظ رکھا جائے گا۔ ۸ راگست کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ وہ اپنی کونسل کی توسیع کر کے اُس میں کانگرس لیگ اور دوسری جماعتوں کو جگہ دینے پر تیار ہیں لیکن کانگرس اور لیگ دونوں نے اس "نام نہاد" رعایت کو ٹھکرا دیا۔ کانگرس نے گاندھی جی کی قیادت میں پھر حکومت کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی اور آزادیٔ رائے اور شہری آزادی کا واسطہ دے کر جنگ کے خلاف نعرے بلند کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور انفرادی "نمائندہ" سول نافرمانی شروع کر دی۔ نہرو اور اور بڑے بڑے لیڈر گرفتار ہوئے اور یہ سلسلہ طُول پکڑتا گیا یہاں تک کہ سر سپرو نے گاندھی جناح اور حکومت سے اپیل کی کہ وہ سب جلد سے جلد اکٹھے ہو کر آپس میں کوئی سمجھوتا کریں تاکہ ایک عارضی قومی حکومت کا قیام عمل میں آسکے۔

ایک غیر حکومت سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ خود ہندوستانیوں میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے اور وہ فرقہ وارانہ مفاد کو ہندوستان کی بہبود اور اتحاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ بیشتر کانگرسی حکومتوں نے اپنے عہد میں مسلمانوں کے بعض جذبات کو پامال کیا جس سے بیزار ہو کر مسلم لیگ نے پاکستان کا انتہا پسند منصوبہ باندھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ گزشتہ پچیس سال میں ہندوستان نے زندگی کے مختلف شعبوں میں خاصی ترقی کی ہے اور بعض نیشنلسٹ رہنماؤں کے سعی و ایثار سے ملک میں بیداری کی ایک رَو دوڑ گئی ہے لیکن جہاں اخلاقِ عامہ کی یہ حالت ہو کہ آنے والی مردم شماری کے لئے مختلف فرقے اپنے ذاتی مفاد کا خیال کرتے ہوئے جھوٹے سچے بیانات دینے پر تُلے ہوئے ہوں وہاں ترقی اور آزادی کی کتنی کچھ اُمید کی جا سکتی ہے۔ دسمبر ۱۹۴۰ء کے ماڈرن ریویو میں ایک محبِ وطن جتندر موہن دتا صاحب نے لمبا چوڑا حساب کرنے کے بعد یہ اندازہ لگایا ہے کہ آج سے ۵۰ سال بعد بنگال میں ہندو آبادی مسلمانوں سے بڑھ جائے گی۔ حیف ہے ایسی اندازہ دانی اور ایسی ذہنیت پر!

ہم وطنو! ہماری جس نکوکاری اور رواداری اور رُوحانیت کا شُہرہ صدیوں رہا، کیا اس آڑے وقت میں وہ ایک ذلیل دُنیا کے یا کم از کم اپنے پست و خوار ملک ہی کے کام نہ آئے گی؟ ذرا سوچو!

بشیر احمد

اِک انوکھی ضَو سے دُنیا جگمگا دی جائے گی　　شمع بزمِ آدمیت کی جلا دی جائے گی　(جوشؔ)

نئے عقیدے

زندگی کیا ہے؛ اور مجھے کیا کرنا چاہیئے؛ خدا جانے کب سے انسان یہ سوال کرتا چلا آیا ہے، شاید انسان کے معنی ہی ہیں ایک ایسا حیوان جو ایسے سوالات کرے۔

حیوان تو مزے سے چراگاہوں میں چلتے پھرتے تھے لیکن یہ حضرتِ اشرف المخلوقات جب نازل ہوئے تو انہوں نے آتے ہی پکارا

لالہ و گُل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

اُس روز سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے اور نہیں معلوم کب ختم ہو؛ جوں جوں انسان ترقی کرتا جاتا ہے نئے نئے مسئلے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ تہذیب نام ہے مسائل اور اُن کے حل کا۔ لیکن حل کیسا؛ ایک عقدہ کُھلتا ہے کہ دُوسرا پڑ جاتا ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ آج کل کے اکثر مہذب لوگ خود شک کے فلسفے کے معتقد ہوتے جاتے ہیں!

لیکن شک اور اعتقاد دو مختلف بلکہ متضاد چیزیں ہیں اور چونکہ انسان بغیر کسی خاص عقیدے کے نہ اطمینان سے اپنی زندگی گزار سکتا ہے اور نہ کوئی مفید کام کر سکتا ہے، اس لئے یا وہ کوئی سہل سا آرام دہ عقیدہ اختیار کر لیتا ہے اور یا پھر اپنی ہمت کے مطابق کسی زیادہ دشوار عقیدے کی فکر میں اپنی عمر گزار دیتا ہے۔

انیسویں صدی میں مغربی تہذیب نے مادّیت کے نظریے میں اپنے لئے ایک اطمینان کی راہ ڈھونڈ لی تھی۔ مہذب انسان نے سمجھ لیا کہ قدرت مخصوص قوانین کے ماتحت کام کرتی ہے، سو اگر میں وہ قوانین دریافت کر لوں گا تو بلاشبہ قدرت پر قابو پا لوں گا۔ سائنس کے چند اکتشافات و ایجادات نے انسان کا دماغ بگاڑ دیا، ریل اور تار، بھاپ اور برق کے نشے سے چُور ہو کر وُہ بھول گیا کہ علم و عرفان کی دُنیا میں وہ ابھی مشکل سے ایک طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا ہے!

مادّیت کی اس چکا چوند پر بیسویں صدی نے آکر اپنا سایہ ڈالا۔ طبیعیات کے نئے نظریوں نے مادّی دنیا کی ہیئت بدل دی۔ نظریۂ اضافیت نے زمان و مکان کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا، "مقادیرِ برقیات"[1] کے نظریے نے مادّی سالمے[2] کو یعنی ہر چیز کے سب سے چھوٹے جزو کو ایک برقی گُودا یا تلملاہٹ کہہ کر ایک سمجھی ہوئی ٹھوس شے کو گویا ایک ناقابلِ فہم نفسیاتی سی کیفیت میں تبدیل کر دیا۔ ارتقا کے نئے نظریات کے مطابق زندگی بجائے ایک میکانی عمل[3] کے ایک تخلیقی قوت[4] بن گئی جو ہر لمحہ ایک نئی سے نئی صُورت اختیار کرتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعیات فلسفے سے گڈمڈ ہو گئی اور سائنس کی دہریت جو مذہب کے اعتقادات کا مذاق اُڑایا کرتی تھی لاادریت[5]

---

[1] مقادیرِ برقیات کا نظریہ = Quantum Theory [2] سالمہ = Atom [3] میکانی عمل = Mechanical action [4] تخلیقی قوت = Creative Power [5] لاادریت = Agnosticism

بن کر خاموش ہوگئی، بعض سائنسدان سائنس اور مذہب کے ملاپ کے لئے تیار ہوگئے، بعض دوسرے مذہب کی ایک نئی تشریح یا ایک نئے مذہب کو دُنیائے حاضر کی سب سے بڑی ضرورت سمجھنے لگے۔ اُدھر دُور اندیش اہلِ مذہب تاڑ گئے کہ مذہب اس جدید نازک صورت حالات سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے لیکن اسی طرح کہ وہ توہمات کے خس و خاشاک سے پاک ہو کر ایک نیا روحانی قالب اختیار کرلے حقیقت یہ ہے سائنس اور مذہب دونوں کے نتائج اور عقائد کی بنیادیں ہل گئیں اور مکانات کے اس تزلزل کے ساتھ مکینوں کے دل بھی ڈململ ہوگئے۔

طبیعیات کے اس قلب ماہیت ہی پر بس ہوتا تو خیر شاید کوئی راہ نکل آتی۔ لیکن ہر علم اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رہا تھا چنانچہ نفسیات کے نظریۂ کردار نے انسان کو محض ایک میکانی سی کل بنا کر رکھ دیا جسے اپنے افعال پر مطلق اختیار نہیں۔ اُدھر نفسیاتی تجزیہ کے نزدیک جبلّت انسان کی اصل اور عقل محض ایک نقل اور ڈھونگ قرار پائی۔ یہ زہد و اتّقا، کی نام نہاد پاک بازی کا ردِّ عمل تھا کہ کھلم کھلا جنسی جذبات کی فطری پوجا ہونے لگی۔ پُرانا اخلاقی نصب العین مٹ گیا، ایک کی جگہ سینکڑوں اصُول اور بے اصُولیاں نمودار ہوگئیں۔

یعنی خود سائنس کے گھر میں پھوٹ پڑ گئی۔ ارتقائیوں نے تخلیقی قوت کی جدت آفرینیوں پر زور دیا۔ نفسیاتیوں نے تحت الشعور کی فطری خواہشات کے نام کا ڈنکا بجایا۔ دوسرے لفظوں میں اُنہوں نے تو کہا کہ انسان صاحبِ اختیار ہے لیکن انہوں نے کہا کہ انسان قطعاً بے اختیار ہے۔

یہ سُن کر مہذب انسان پر جو گزری اور گزر رہی ہے وہ ہم سب کی نظروں کے سامنے ہے۔ مہذب دُنیا میں افراتفری پڑ گئی۔ مذہب پُرانا ہو چکا تھا، سائنس دم بدم اپنے نئے سے نئے اور متضاد نظریے پیش کر رہی تھی، فلسفہ کبھی یکسوئی کا دعوے دار ہی نہ تھا، انسان کرتا تو کیا کرتا؟ اس اینچا تانی میں اُس کا اطمینانِ قلب جاتا رہا۔ اُس کی زندگی مختلف طاقتوں کی رسہ کشی کے درمیان ایک لاحاصل سی کش مکش بن گئی۔ کہیں چین نہ پا کر اُس نے اُدھر طاقتوروں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور ادھر اپنی نفسیاتی خواہشوں کے آگے۔ نوعِ انسان میں جو تھوڑی بہت ہم آہنگی تھی وہ بھی نہ رہی۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ، وہ قیامت کا شور اُٹھا کہ دُنیا الامان پکار اُٹھی!

لیکن زندگی وہ قوت ہے کہ ہزار تباہیوں پر بھی قائم ہے ہزار موتوں میں بھی کسی نہ کسی طرح زندہ ہے۔ بظاہر مٹ جائے، کہنے کو ملیامیٹ ہو جائے لیکن پھر بھی موجود ہے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں۔ قوتِ عظمیٰ اپنے ہر کارکن کو للکار کے کہہ رہی ہے ؎

آتی نہیں جہاں میں کبھی زندگی کو موت خود موت زندگی کا نشاں ہے غم نہ کر
فرد مر جائے جماعت قائم ہے بستی اُجڑ جائے دُنیا موجود ہے، دُنیا بھی برباد ہو جائے کائنات پھر بھی ہوگی نہ معلوم سہی کیسی؟

اِس قوتِ لایزال کا سب سے بڑا مظہر جس کا ہمیں یقینی علم ہے انسان ہے۔ انسان پر ہزاروں مصیبتیں آئیں لیکن وہ لاکھوں برس سے اس ننھے سے سیارے پر بے دھڑک اپنی زندگی بسر کرتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قسمت جو اُس پر لحظہ بہ لحظہ بیسیوں آفتیں ڈھاتی

نفسیات = Psychology ✢ نظریۂ کردار = Behaviourism ✢ نفسیاتی تجزیہ = Psycho-analysis

ارتقائی = Evolutionist ✢ "نفسیاتی" = Psychologists ، تحت الشعور = Sub-Conscious ✢

ہے وہی لحظہ بہ لحظہ اُسے اُکساتی اور اُبھارتی اور نہیں معلوم کہاں سے کہاں لئے جاتی ہے !

موجودہ دُنیا بُرے حال میں ہے، تمدن پر بجلیاں گر رہی ہیں، زلزلے آرہے ہیں لیکن باوجود اس تمام کرب واندوہ کے نوعِ انسان کے رہنما اپنا سر بلند کئے ہوئے کاروانِ حیات کی رہبری کا خوشگوار فرض ادا کر رہے ہیں۔ آفرین ہے اِن کی ہمت پر اور اِن کے دل پر جو اپنے کام ہی کو اپنا بہترین صلہ سمجھتا ہے۔

اِس سلسلے میں ہم حال کے چند مفکرین کے خیالات پیش کرتے ہیں جنہوں نے دُنیا اور زندگی اور نوعِ انسان کے دشوار مسائل پر اپنی محدود عقل کی روشنی بلکہ کہنا چاہیے روشنیاں ڈالی ہیں۔

اِن میں سے ہر ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف عقیدہ رکھتا ہے لیکن ہم کو اس اختلافِ رائے سے گھبرانا نہ چاہیے۔ سچ پوچھو تو دُنیا میں ہر شخص کا عقیدہ مختلف ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے جس طرح کوئی دو شخص شکل وشباہت میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے اِسی طرح وہ اپنے جذبات وتصورات اور معتقدات میں بھی منور کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ قدرت نے ہر شخصیت کو الوکھا بنایا ہے ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن — اے ذوقؔ! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

لیکن جہاں یہ اختلافات ہیں وہاں بعض معاشری حالات اور قدرتی قوانین کی یکسانیت کے باعث نوعِ انساں کی جسمانی و ذہنی سرگرمیوں میں مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ انسان ایک معاشرتی جانور ہے انسانی فرد کا وجود، کم از کم اُس کا فروغ، بغیر جماعت کے ناممکن ہے۔ اس لحاظ سے ہر فرد پر بعض اجتماعی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، وہ لازم طور پر دوسروں کے خیالات واعمال سے متاثر ہوتا ہے۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ نوعِ انسان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور وہی فردِ بشر صحیح معنوں میں زندہ ہے جو نہ صرف اپنے اعمال کو بلکہ اپنے عقیدے کو بھی دوسروں کے عقائد کی روشنی میں دیکھے اور پرکھے اور ضرورت ہو تو اس کو کچھ نہ کچھ تبدیل کرے صحیح ایمان وہی ہے جو دہریت سے دوچار ہو کر بھی خود شناسی کے ایک زیادہ اعلےٰ مرتبے پر پہنچ جائے !

۱۹۳۱ء میں امریکہ میں ایک کتاب شائع ہوئی جس کا عنوان تھا "زندہ فلسفے"۔ یہ بائیس مفکرین کے مضامین کا مجموعہ تھا۔ اس میں اُنہوں نے دُنیا اور انسان کے متعلق اپنا اپنا ذاتی عقیدہ بیان کیا۔

اس کے تقریباً دس سال بعد ۱۹۳۹ء میں اسی کتاب کے ناشرین نے اکیس اور مفکرین کو اسی قسم کی دعوتِ فکر دی اور پہلے بائیس اصحاب سے بھی دوبارہ درخواست کی کہ اگر وہ اپنے سابق فلسفے میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو اُس کا اظہار کر دیں۔ اِن نئے ۴۲ مضامین کا مجموعہ "میرا عقیدہ" کے عنوان سے ۱۹۴۰ء میں نیویارک سے ایک کتابی صورت میں شائع ہوا۔

پچھلے دس برس میں مہذب دنیا میں ایک نہایت اہم انقلاب برپا ہوا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب اشتمالیت* نے رُوس

اشتمالیت = * Communism

میں اپنے قدم جمائے تو خیال تھا کہ دُنیا اب سرمایہ داری اور اشتمالیت کے دو مخالف نظامات کا اکھاڑا بنے گی اور آہستہ آہستہ اشتمالیت کا پلہ بھاری ہوتا جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ اور اس کے اندر ہی ایک اور اکھاڑا تیار ہو گیا جس میں ایک طرف آمریت تھی اور دوسری طرف جمہوریت۔ دونوں نے اپنے اپنے پروپگنڈا سے لوگوں کے دل و دماغ پر اپنے اپنے خیالات کا تسلط جمایا۔ مغربی تہذیب کی ثقافتی روایات میں جن کا ایک اہم جزو فرد کی آزادیٔ خیال تھا ایک عجیب و غریب تبدیلی آگئی۔ انفرادیت آمریت پرستی میں کھوئی گئی ۱۹۳۹ء کی دُنیا ۱۹۲۹ء کی دُنیا سے بالکل مختلف نظر آنے لگی۔ مذکورہ بالا کتاب کا جامع بیان کرتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۱ء کے "زندہ فلسفے" ۱۹۴۰ء میں محتاجِ تشریح معلوم ہوئے اور یہ دیکھنے کی ضرورت پیش آئی کہ کہاں تک بعض دیگر جدید مفکرین کے "نئے عقیدے" اُن کی تصدیق کرتے ہیں اور کیونکر اُس عقلیت کی مخالف تحریک کا جواب دیتے ہیں جو تہذیبِ حاضر کی آزادی پسند روایات کا قلع قمع کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔

دونوں جلدوں کے مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جن میں انسانی فطرت کی مستقل خصوصیات اور مستقل مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرے وہ جن میں موجودہ المناک صورتِ حالات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

ان ۴۳ مقالہ نگاروں میں ۱۸ امریکی، ۱۶ برطانوی، ۳ جرمن، ۲ فرانسیسی، ۲ چینی ایک ناروی اور ایک سپینی امریکی ہے۔ پیشے یا کام کے لحاظ سے اِن میں سائنس دان، فلسفی، شاعر، نقاد، ناول نویس، معلم، مؤرخ، ایڈیٹر، سفیر، ظرافت نگار سب شامل ہیں۔ عقیدے کی رُو سے اِن میں دہریے، لاادریے اور شک پرست لیکن ساتھ ہی مذہب پرست اور رُوحانیت پسند بھی ہیں۔ یہ نکتہ غور کے قابل ہے کہ بعض متضاد عقائد میں بھی اتنا فرق نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ بعض معتقدین اور منکرین دراصل ایک دوسرے سے کچھ زیادہ دُور نہیں ہوتے۔ نوعِ انسان کا بہت سا وقت اور زور فضول بحثوں میں صرف ہو جاتا ہے۔ ایک بلند نظر خدا پرست نے کیا خوب کہا ہے:۔

انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا — دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے

سیاسی میلان کے لحاظ سے یہ مقالہ نگار زیادہ تر جمہوریت پسند ہیں گو بہت کم ہیں جو جمہوریت کی موجودہ صورت سے مطمئن ہیں بعض اشتمالیت کے نام لیوا ہیں، انہیں میں چند ایسے بھی ہیں جو دس برس ہوئے جمہوریت پرست تھے لیکن آج رُوسی مارکسیت کے شیدائی ہیں۔ بعض طبعاً امید پرست ہیں اور ایک آدھ یاس پرست بھی ہے۔ کوئی اخلاق پر زور دیتا ہے۔ کسی کا فلسفہ تجربے کا فلسفہ ہے، کوئی زندگی کو ایک ایسا معرکہ پکارتا ہے جس سے ہم نوائی پیدا ہوتی ہے، اور کوئی کہتا ہے کہ شک پرستی اور اعتقاد کے درمیان گھڑی کے رقاص کی طرح جھولتے رہنا ہی حقیقت کو پالینا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ زندگی بسیار پہلو ہے، اُس کی ترقی صرف ایک مخصوص رستے پر سفر کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ کوئی زندگی کے مسائل کو فراموشی میں غرق کر کے دُنیا کی ہر شے کو ظرافت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر شخص کا اپنا اپنا فلسفۂ زندگی ہے۔ اور کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ جو شخص بھی اپنے فلسفے میں خوش رہے اُس کے لئے وہی فلسفہ درست ہے اور بہترین ہے

آمریت = Dictatorship + ثقافتی روایات = Cultural traditions + معاشری اِدارات = Social institutions.

انفرادیت = Individualism + عقلیت = Intellectualism + مارکسیت = Marxism +

یہ سارے مختلف فلسفے اور عقیدے اِس لئے جمع نہیں کئے گئے کہ پڑھنے والا اُن میں سے کسی ایک کو چُن لے اور اُسے گویا اپنا بنا کر مزے سے زندگی گزارے۔ کم از کم ایک ہوش مند انسان کے لئے دوسروں کے عقیدے اور خیالات صرف ایک حد تک رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اُس کا صحیح عقیدہ اُس کا اپنا عقیدہ ہوگا جسے وہ دل سے مانے اور پھر اُس پر جہاں تک ہو سکے عمل کرے!

ذیل میں ہم مذکورہ بالا مفکرین میں سے بعض اصحاب کے خیالات کا خلاصہ اور اس کے نیچے اُن کے مقالات میں سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں۔

آئین شٹائن

(”اِضافیت“ کے انقلاب انگیز نظریے کا واضع اور دُنیا کا سب سے ممتاز سائنس دان ہے۔ اِسے مشہور ”نوبل پرائز“ مل چکا ہے۔ یہ ۱۸۸۵ء میں جرمنی میں پیدا ہوا لیکن بعد کو اس نے سوِس قومیت اختیار کر لی۔ ۱۹۱۵ء میں اس نے برلن میں اپنا نظریۂ اضافیت پیش کیا۔ جس کی رُو سے زمان و مکان کا تصوّر اُور سے اُور ہو گیا۔ یہ ایک یہودی ہے اور یہودیت کا زبردست مؤید۔ یہ وائلن (سارنگی) خوب بجاتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے برسرِ اقتدار آنے پر یہ جرمنی سے نکال دیا گیا۔ آج کل یہ ممالکِ متحدہ امریکہ میں پرنسٹن کی یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر ہے۔)

۱۹۳۰ء

آئین شٹائن کا خیال ہے کہ انسان فلسفیانہ نقطۂ نظر سے صاحبِ اختیار نہیں لیکن وہ فرد کی شخصیت کو ایک قیمتی شے سمجھتا ہے۔ گو ساتھ ہی وہ اِس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان محض اپنے ہم جنسوں کی مدد سے ترقی کر سکتا ہے۔

وہ جمہوریت میں یقین رکھتا ہے اور آمریت کا سخت مخالف ہے۔ معاشرت کے طبقوں کو بُدا رکھنے والے امتیازات اُس کی نگاہ میں غلط ہیں۔ جنگ اور ”حب الوطنی کی ملعون شے“ کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

اُس کی رائے میں ”اپنے وجود یا زندگی کے مفہوم پر دن رات غور کرتے رہنا سخت نادانی ہے“۔ وہ انسان نما خدا کا قائل نہیں، اور نہ وہ حیات بعد الموت کو مانتا ہے لیکن وہ پُراسرار حقیقت کے حُسن کا شیدائی ہے اور اس معنی میں ”پکے مذہبی آدمیوں کی جماعت میں شریک“ ہے۔ وہ ”نیکی خوبصورتی اور سچائی“ کا دلدادہ ہے۔ یعنی آئین شٹائن کے فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان ایک قابلِ قدر ہستی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔ اور سب سے حسین شے وہ سمجھ میں نہ آنے والی حقیقت ہے جس پر غور و خوض کر کے حیران ہونا اور اُسے تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کرنا زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اور انسان کی سب سے بڑی خوشی ہے۔

۱۹۳۹ء

۱۹۳۹ء میں جب آئین شٹائن سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے ۱۹۳۰ء کے مقالے پر جس کا خلاصہ اُوپر درج کیا گیا ہے پھر ایک نظر

---

[۱] آئین شٹائن۔ رسل اور ولز کے مضامین کا مفصل اقتباس ”ہمایوں“ میں جنوری اور فروری ۳۴ء کے نمبروں میں ”زندہ فلسفے“ کے عنوان سے پیش کیا جا چکا ہے۔ یہاں ان مصنفین کے خیالات کا صرف خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

”اِضافیت“ = Relativity

ڈالے اور مزید اظہار خیال کرے تو اس کے جواب میں اُس نے کہا کہ جو کچھ میں نے پہلے لکھا تھا وہ ہے تو اب بھی بالکل صحیح لیکن وہ آج کل کچھ عجیب و غریب اور دور دراز کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اِن دس برس میں انسانی معاشرت کے استحکام بلکہ اُس کے وجود تک میں اعتماد بڑی حد تک کھویا جا چکا ہے۔ وہ شائستگی جو انسان نے ورثے میں پائی تھی آج خطرے میں ہے۔ جنگ عظیم آئی اور چلی گئی، نیکی ترقی اور سچائی کے معیار قایم رہے۔ لیکن فاشی ریاستوں کی آمد کے ساتھ اجتماعی سلامتی کا قلع قمع ہو گیا۔ آج یورپ کے بیشتر حصے میں عقل کی آزادی مفقود ہے، چند منظم لٹیروں نے عوام الناس کو مرعوب و خوفزدہ کر رکھا ہے اور نوجوانوں کے دل و دماغ جھوٹ کے ایک باقاعدہ مسلسل پروپگنڈا سے زہر آلود ہو چکے ہیں۔

"اِن حالات سے آگاہی میری موجودہ زندگی کی ہر ساعت پر ایک تاریک بادل کی طرح چھائی ہوئی ہے"۔ تاہم میں جانتا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی انسان بہت کم بدلتا ہے۔" "جو کچھ آج ہو رہا ہے اِس میں سے سوائے تاریخ کی کتابوں میں چند افسوسناک صفحات کے جن سے محض آنے والی نسلوں کے نوجوانوں کو اپنے بزرگوں کی جہالت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا اور کچھ بھی باقی نہ رہے گا"۔

(مزید اقتباسات)

"عجیب ہے ہماری حالت اِس دُنیا میں۔ ہم میں سے ہر ایک یہاں تھوڑی دیر کے لئے آتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ کس لئے گو کبھی کبھی ہمیں اِس مقصود کی ایک جھلکی سی دکھائی دیتی معلوم ہوتی ہے"۔

"انسان اس دُنیا میں دوسرے انسانوں کے لئے پیدا ہوا ہے"۔

"بلاشبہ انسان وہ کام کر سکتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے لیکن خود اُس کا ارادہ اُس کے اختیار سے باہر ہے"۔ (شوپن ہار)

"وہ نصب العین جو ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے چمکتے رہے اور جن کے باعث میرا دل زندگی کے لُطف و نشاط سے لبریز ہو گیا۔ نیکی، خوبصورتی اور سچائی ہیں۔ آسائش یا خوشی ہی کو اپنا مقصد بنا لینے کی طرف میں کبھی راغب نہیں ہوُا، اخلاق کا نظام جو ایسی بنیاد پر قائم ہو صرف ڈھوروں کے ایک گلّے کے لئے کافی ہوگا"۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ایک سادہ اور بے تصنع طریق زندگی ہر شخص کے لئے بہترین ہے اور جسم و نفس دونوں کے لئے مفید ترین"۔

"بطور ایک فرد کے ہر شخص کی عزت لازم ہے لیکن کسی کی پرستش نہ ہونی چاہئے"۔

"زمانہ کئی بار ثابت کر چکا ہے کہ ممتاز ظالموں کے بعد فاسق شخص زور پکڑتے ہیں"۔

"ہماری زندگی کی جد و جہد میں جو شے فی الحقیقت بیش بہا ہے وہ میری رائے میں قوم نہیں بلکہ وہ ہے فرد کی تخلیقی اور اثر پذیر شخصیت جس سے ممتاز و اعلیٰ حقائق ظہور میں آتے ہیں"۔

"سب سے حسین چیز جو ہمارے تجربے میں آسکتی ہے وہ مخفی اور بعید الفہم حقیقت ہے۔ وہی ہے سرچشمہ تمام صحیح آرٹ اور سائنس

کا۔ وہ شخص جو اس جذبے سے عاری ہے جو مظاہر کو دیکھ کر حیران و مبہوت نہیں ہو جاتا وہ محض مردہ ہے۔ اُس کی آنکھیں بند ہو چکی ہیں"۔

"یہ جان لینا کہ وہ جو انتھاہ ہے ہے منوّر اور اس کا ظہور اعلےٰ ترین عقل اور روشن ترین حسن میں ہوتا ہے جسے ہمارے کند قوائے محض اِک ذرا سا سمجھ سکتے ہیں، یہ علم یہ احساس بس یہی سچی مذہبیت کی جان ہے"۔

"مجھے یقین نہیں کہ فرد اپنے جسم کی موت کے بعد زندہ رہتا ہے۔ میرے لئے تو یہ کافی ہے کہ پُرشعور زندگی کے معمے کو سوچوں کہ وہ کس طرح ازل سے ابد تک اپنے آپ کو قائم رکھتی ہے، کائنات کی حیرت انگیز ساخت پر جسے ہم محض ذرا سا دیکھ سکتے ہیں غور کروں اور انکسار کے ساتھ اُس دانشمندی کے ننھے سے ننھے حصّے کو سمجھنے کی کوشش کروں جو فطرت میں آشکار ہے"۔

برٹرنڈ رسل (غالباً انگلستان کا سب سے بڑا زندہ فلسفی ہے۔ بطور ریاضی دان ماہر تعلیم اور فلسفی ہونے کے یہ امریکہ اور یورپ دونوں جگہ انتہائی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی بعض عام فہم اور ہر دلعزیز تصنیفات یہ ہیں "تعلیم"، "شادی اور اخلاق"، "خوشی کی تسخیر"، "طاقت" وغیرہ۔ اس کی عمر اس وقت ۶۰ سال ہے)

سنہ ۱۹۳۰ء

رسل کہتا ہے کہ دنیا کے متعلق میرے خیالات اوروں کی طرح کچھ میرے حالات اور کچھ میری طبیعت کا نتیجہ ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر کے بعد پہلے انسانی اختیار، پھر بقائے روح اور پھر ذاتِ باری میں اُس کا اعتقاد جاتا رہا یہاں تک کہ اُس نے مسیحیت کو قطعاً ترک کر دیا۔

جنگِ عظیم چھڑنے پر جو ہیجان اُس کے دل میں پیدا ہوا اُس سے سیاسی معاشری اور اخلاقی مسائل کے متعلق اُس کے خیالات میں ایک تبدیلی واقع ہوئی۔ اور وہ "صلح پسندانہ" کام کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو گیا جس کے باعث اُس کے ہم قوم اُسے ناپسند کرنے لگے۔ اُس نے دیکھا کہ ہر قوم خواہ مخواہ اپنے آپ کو سچا اور اپنے دشمن کو جھوٹا ثابت کرنے پر آمادہ ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جنگ کی زیادہ تر یہ وجہ ہوتی ہے کہ لوگ جنگ کرنا چاہتے ہیں اور پھر کسی نہ کسی طرح اُس کے جواز کی وجہ گھڑ لیتے ہیں۔ پھر اُس نے اس امر پر غور کیا کہ قدرت نے انسان کی فطرت میں جو خواص رکھے ہیں اُن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کوئی ایسا طریقہ تلاش کیا جائے جس سے لوگ آپس میں مل جل کر زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے کی بربادی اور ذلت کے درپے نہ رہیں۔

رسل کے معاشری فلسفے کا اصل الاصول نفسیات کی اہمیت ہے اور یہ طرزِ خیال کہ معاشری ادارات کی اچھائی بُرائی کا اندازہ محض انسانی فطرت پر اُن کے اثرات کو دیکھ کر کرنا چاہئے۔

وہ کہتا ہے کہ جانوروں کی طرح انسان میں بھی دو قسم کے جذبے موجود ہیں، کشش کا جذبہ اور خوف کا۔ اور پھر سمجھتا ہے کہ اب انسان ارتقا کی ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ اُسے اپنی حفاظت کے لئے خوف و نفرت کی بہت کم اور اپنی اور دوسروں کی ترقی

صلح پسندانہ کام = Pacifist work ۔ امن پرستی، صلح پسندی = Pacifism ۔ جذبہ = Emotion

کے لئے اُنس و محبت کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

نوعِ انسان کی موجودہ مصائب کا علاج اُس کے نزدیک بین الاقوامی حکومت، کاروباری تنظیم، ضبطِ تولید اور صحیح قسم کی تعلیم و تربیت میں ہے۔ اس کے برعکس ہماری موجودہ نفسی حالت اور قومی تنظیم کے ہوتے ہوئے سائنس کی ترقی کے معنی یہی ہیں کہ تمدن کی بربادی کے دن زیادہ قریب آ رہے ہیں۔

۱۹۳۹ء

رسل کہتا ہے کہ اُس کے خیالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن بعض امور پر اب وہ زیادہ زور دینا چاہتا ہے۔ اشتمالیت اور فاشیت نے آکر آزادی کے مسلمہ اصُولوں کو مسترد کر دیا ہے لیکن مذہبی لڑائیوں کی طرح اِن نئی تشدد آمیز تحریکات کے بعد بھی ایک عقل کا دَور پھر آئے گا۔ ایک جنگ کا نتیجہ ہمیشہ دوسری جنگ ہوتا ہے اور کم از کم اربابِ عقل کو جنگی جوش کے دنوں میں اپنے ہوش و حواس قائم رکھنے چاہئیں۔

اوائلِ عمر میں" مجھے اپنی وہ مایوسی ہمیشہ یاد رہے گی جب میں نے دیکھا کہ اقلیدس بھی اپنے علم کی ابتدا مفروضات سے کرتا ہے"۔

"صاحبِ عقل کا سوسائٹی میں اگر کوئی کام ہے تو فقط یہ ہے کہ وہ جوش و خروش کے اوقات میں سرد مزاجی اور بے تعصبی سے رائے قائم کرے"۔

"نوجوانوں میں سے اکثر نے مایوس ہو کر کلبیت و استہزا اختیار کر لیا ہے لیکن میں کبھی قطعاً مایوس نہیں ہُوا اور اس لئے مجھے ہمیشہ یقین رہا ہے کہ فلاح و بہتری کا رستہ ابھی تک نوعِ انسان کے لئے کھُلا پڑا ہے"۔

"کسی قسم کے اخلاقی اصول بھی باہمی محبت کی جگہ کام نہیں دے سکتے اور جہاں محبت پُرخلوص ہو اگر وہ عقل کے دوش بدوش چلے تو وہ خود بخود ایسے ضروری اصُول وضع کر لے گی"۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اُس طاقت و اختیار سے جو ہم نے اپنے علم کے ذریعے سے قدرت پر حاصل کیا ہے ہم پُورا پورا فائدہ اُٹھائیں تو لازم ہے کہ ہم اپنے خیالات و جذبات پر قابو حاصل کریں۔ بجائے غلام کے عاجزانہ اور غصہ آمیز خوف کے ہمیں اپنے نفس میں ایک آقا کی سی مطمئن خودداری پیدا کرنی چاہئے"۔

"دنیا میں امن و سلامتی کا دور دَورہ نہ ہوگا جب تک قوموں کے مابین بھی وہ قواعد نافذ نہ کئے جائیں گے جو اب تک صرف ایک ملک یا قوم کے اندر رائج ہیں۔ جب تک دُنیا کی ساری فوجیں ایک ہی عالمگیر حکومت کے تحت میں کام نہ کرنے لگیں گی، دُنیا کی حالت نہ سُدھر سکے گی"۔

دُنیا میں بہت سی نفرت سُوءِ ہضم اور غدود کے ناقص عمل سے ظہور میں آتی ہے اور یہ جوانی میں جذبات کے دباؤ اور غلط ضبط کا نتیجہ ہوتا ہے"۔

ضبطِ تولید = Birth control : مفروضات = Axioms ؛ کلبیت = Cynicism ؛ غدود = Glands ؛

جون ڈیوئی

(امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر ہے۔ یہ امریکہ اور یورپ کے سب سے بڑے فلسفیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اِس کے عملی یا تجربی نقطۂ نگاہ کا متمدن دنیا میں خاص طور پر تعلیم کے متعلق نہایت گہرا اثر پڑا ہے۔ اس کی عمر ۷۱ سال ہے)

سنہ ۱۹۳۰ء

ڈیوئی تجربی فلسفے کا سب سے بڑا علَم بردار ہے یعنی وہ فلسفہ جو زندگی کے تمام مسائل کے لئے تجربے کے معیار کو فیصلہ کُن سمجھتا ہے۔

ڈیوئی کہتا ہے کہ اعتقاد کبھی بیرونی سند پر مبنی ہوتا تھا لیکن آج "اعتقادِ عمل کی طرف رُجحان ہے"۔ یعنی صرف تجربہ ہی فیصلہ کُن سند ہے۔ آج تک اخلاقی اور مذہبی مسلک محض ایک جائے پناہ بنے رہے ہیں جہاں انسان چپکے سے دبک کر بیٹھا رہا، اب سائنس نے آکر اپنے تجربات سے ساری فضا بدل دی ہے۔ اب صرف سائنس کا طریقِ عمل انکشافِ حقیقت کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سے خود اعتمادی ضبط اور سلامتی پیدا ہوتی ہے۔ پہلے انسان ہر قسم کے تغیرات سے ڈرتا تھا۔ اور یہ مان لیا گیا تھا کہ مسیحیت آخری اور مکمل ترین مذہب ہے اور خاندانی نظام اور شادی کے سلسلے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن سائنس نے آکر سمجھایا کہ زندہ ہونا معرضِ عمل میں رہنا ہے ؎

اس رہ میں مقام بے محل ہے   پوشیدہ قرار میں اجل ہے

سب انسانی ادارے اور نظامات لازم طور پر بدلتے ہیں۔ تجربی فلسفے کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ کیا کیا تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور ان تبدیلیوں کو کیونکر سمجھداری کے ساتھ سیدھے رستے پر لگانا ہے۔ عام فلسفے زندگی میں ایک ہمہ گیر وحدت کو ڈھونڈتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زندگی کا ایک خاص مفہوم ہے اور کائنات کا ایک خاص مقصد۔ ڈیوئی اس نقطۂ نگاہ سے اتفاق نہیں کرتا۔ ڈیوئی کہتا ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم سمجھیں کہ یا تو زندگی بے معنی ہے اور یا اُس میں صرف ایک ہی خاص معنی و مفہوم ہے۔ اُن تمام حالات میں جن سے ہم دوچار ہوتے ہیں بہت سے معنی اور بہت سے مقصد بروئے کار آتے ہیں گویا ہر حالت میں ایک خاص معنی و مقصد ہوتا ہے جو اپنی مخصوص قدر و قیمت رکھتا ہے اور جو ہمیں فکر و عمل کی مخصوص دعوت دیتا ہے۔ زندگی باہم مربوط معانی و مقاصد کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ کثرت زندگی کے گوناگوں تجربوں میں متواتر دریافت اور مسلسل فروغ کی خوشیوں کا سرچشمہ ہے۔ اگر زندگی کے ہر تجربے کو ہم ایک آنے والے زیادہ معنی خیز تجربے کا پیش خیمہ سمجھ لیں تو پھر ہمارے لئے غم و اندوہ بھی مسرت خیز ثابت ہوں گے۔

کیا اس طرزِ خیال سے مذہب پر زد پڑتی ہے؟ اگر مذہب محض فوق الفطرت پر اعتقاد اور غیر متغیر عقیدے کا نام ہے تو مذہب تجربی فلسفہ کی زد سے نہیں بچ سکتا، لیکن انسانی فطرت اور تاریخ سے ظاہر ہے کہ مذہب کی عقلی صورت نے ہمیشہ اپنے تئیں مستند علمی اور معاشری حالات کے مطابق بنا لیا ہے۔ آج کل مذہب کے لئے بڑا خطرہ اس بات میں ہے کہ وہ قدیمی ادارت اور بوسیدہ رسم و رواج کا محافظ بنا ہے۔ مذہب کا مستقبل اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ انسانی تجربے اور انسانی تعلقات کی ممکنات میں اعتقاد پیدا کر کے انسان کے دل میں اپنی نوع کے مشترکہ مفاد کی زندہ حِس کو اُبھارے اور اُسے اس پر عمل کے لئے آمادہ کر دے۔ سچی مذہبی حس کو انسانی کاروبار

تجربی فلسفہ = Philosophy of experience ۔ ہمہ گیر وحدت all-embracing unity

فوق الفطرت = super-natural ۔ مشترکہ مفاد = Common Interest ۔

اور معاشی ضروریات میں گہری دلچسپی لینی چاہیئے۔ آج کل امیر طبقے کو جو فائدے حاصل ہیں وہ دراصل نہ خود اُسے اور نہ نوع انسان کو خوش و مطمئن بناتے ہیں۔ تجربی ممکنات کا فلسفہ ایک ایسی معاشری زندگی کو وجود میں لانا چاہتا ہے جس کے وفور میں سب برابر کے شریک ہوں۔

موجودہ علیحدگی پسندی کا ایک مظہر ہماری قومی زندگی ہے۔ یہ حب الوطنی کا نتیجہ ہے کہ قومیں ایک دوسری کی طرف چھپی ہوئی عداوت لئے ہوئے مصروف کار رہتی ہیں۔

فرد کا جماعت سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ کوئی انفرادی تجربہ اجتماعی زندگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اب تک محبت شادی اور خاندانی زندگی کی ساخت زیادہ تر مردوں کی مرضی کے مطابق رہی ہے لیکن عورتوں کی نئی آزادی یقیناً اب انسانی اخلاق کو اس سے بہتر بنانے اور جِلا دینے کا کام دے گی۔

ہمارے زمانے کی خصوصیت ہر قسم کے تعمیری فلسفے کا فقدان ہے۔ انیسویں صدی کی آزادخیالی کا موجودہ پیچیدہ معاشرتی مسائل اور جنگِ عظیم کے صدمات نے خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ اُس کی جگہ ایک ایسے ازالۂ وہم اور شک پرستی نے لے لی ہے جو گویا موجودہ مہذب انسان کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ شک کرنا تعلیم یافتہ آدمی کی نشانی ہو گئی ہے وہ دکھاوے کے لئے بھی شک کا اظہار کرتا ہے۔

لیکن یہ مظاہرے محض عارضی ہیں۔ ایسے حالات میں تجربے کا فلسفہ اپنا مخصوص کارِ منصبی رکھتا ہے۔ اُس کے لئے روایتی اور قدیمی خیالات و تصورات کی بیکاری و تباہی ایک زرّیں موقع ہے۔ ایک ایسی نوع کا تجربہ پیدا کرنا جس میں سائنس اور فنون صنعت و حرفت، سیاست، مذہب، خانگی زندگی اور عام انسانی تعلقات پر اثر انداز ہوں۔ ہے ایک انوکھی چیز لیکن اس میں اعتقاد محض ایک خواب یا فضول خیال نہیں۔ یا ایک اعتقاد ضرور ہے لیکن ایک ایسا فلسفیانہ اعتقاد ہے جو عمل پر مائل ہونے کی وجہ سے عمل ہی سے آزمایا اور پرکھا جا سکتا ہے یہی ہے موجودہ حالات میں ایک پنپنے والا فلسفہ۔

۱۹۳۹ء

"میں نے لکھا تھا کہ فرد کا انحصار اجتماعی زندگی کی نوعیت پر ہے۔ میں اب کہتا ہوں کہ افراد ہی اجتماعی زندگی کی نوعیت اور ترقی کے فیصلہ کُن لازمی اجزا ہیں"۔ یہ بات آخری دس برس کے واقعات نے ثابت کر دی ہے۔ صرف افراد کا آزادانہ تعاون ہی ایسے معاشری ادارات وجود میں لا سکتا ہے جن سے آزادی محفوظ رہ سکتی ہے۔ پرانے فلسفہ انفرادیت نے ایک طرف اشتمالیت اور دوسری طرف مطلق العنانی کی ایک نئی شکل پیدا کر دی۔ ان دونوں کے درمیان فرد بیکار ہو کر رہ گیا۔ موجودہ افسوسناک حالات سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ایک تو شہری آزادی کو بزور قائم رکھا جائے اور دوسرے افراد کو رضاکارانہ طور پر مل کر کام کرنے کے زیادہ سے زیادہ موقع بہم پہنچائے جائیں۔

---

* سچی خوشی زندگی سے صرف اس طرح مل سکتی ہے کہ ہمارے تمام قوار تجربے کی ہر بدلتی ہوئی حالت سے اُس کا پورا اور انوکھا مفہوم

علیحدگی پسندی isolationism + ازالۂ وہم disillusionment + شک پرستی scepticism +

حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

"بے سُود دکھاوا اور عیش و عشرت، زیادہ سے زیادہ چیزوں پر قبضہ کر کے خوش ہو جانے کی فضول کوشش، لوگوں میں بڑا مرتبہ پانا، دوسروں پر معاشی طاقت پا لینا یہ سب موجودہ حالات سے فائدہ اُٹھانے والوں میں فی الحقیقت محض تجربے کی رُکاوٹ کا اظہار ہیں۔ اِسی کا نتیجہ ہے باہمی خوف، شبہات اور حسد۔ یہ تمام چیزیں انسانی تجربے کو اِس قدر بھٹکانے والی اور کنگال کر دینے والی ہیں کہ اس کا اندازہ کرنا ممکن ہے۔"

"ہمارے قومی اخراجات کا اسی فیصدی حصّہ یا پچھلی لڑائیوں کا خمیازہ بھگتنے میں خرچ ہوتا ہے یا آنے والی لڑائیوں کی تیاری میں۔"

اِیچ جی وِلز (۱۸۶۶ء میں پیدا ہُوا۔ یہ پہلے ایک پارچہ فروش کے ہاں بطور شاگرد کے کام کرتا رہا۔ بتدریج اس نے انگلستان میں اپنی گوناگوں علمی و ادبی تصنیفات سے عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ یہ نہ صرف ناول نویس ہے بلکہ انسانی سوسائٹی پر طبیعی و مذہبی و معاشی اثرات کا اندازہ لگانے اور معاشرتی پیشین گوئیاں کرنے میں آج کل کے مفکرین میں ممتاز ہے۔ اُس کی تصنیفات میں سے چند یہ ہیں: "تاریخِ دُنیا پر ایک نظر"، "علمِ زندگی"، "نوعِ انسان کا کام دولت اور خوشی"، "آنے والی چیزوں کا خاکہ"۔)

سنہ ۱۹۳۰ء

وِلز اپنے عقیدے کے اظہار میں پانچ چھ اہم باتوں کی طرف ہمیں توجہ دلاتا ہے۔ پہلے بقا کا مسئلہ آتا ہے۔ وہ کہتا ہے "میں آج وہ ایچ جی وِلز نہیں ہوں جس کی عمر کبھی ایک سال تھی یا جو پھر بیس سال کا ہُوا۔ اُس وِلز کا بہت سا حصّہ مر چکا ہے۔ میں اب کچھ اَور ہوں۔ مجھے اب اُس سے بہت کم تعلق ہے۔ اس کے برعکس بعض اَور لوگوں سے اب میرا تعلق زیادہ قریب کا ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ خیالات کا سلسلہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لا رہا ہے۔ "ہم فانی ہستیاں ہیں جو ایسے خیالات کی پکار پر لبیک کہتی ہیں جو شاید غیر فانی ہیں۔ ہم محض اپنا آپ نہیں ہیں، ہم انسانی فکر و تجربہ کا بھی ایک جزو ہیں"۔

ایک دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ فرد کیا چیز ہے؟ بظاہر ہر فرد ایک مکمل اور جداگانہ ہستی معلوم ہوتا ہے لیکن در اصل ایسا نہیں ہے۔ حیاتیات کا علم ہمیں بتاتا ہے کہ اگرچہ انسان بہ نسبت بعض حیوانوں کے ایک بہت زیادہ منفرد ہستی ہے لیکن وہ مکمل طور پر منفرد نہیں مثلاً اُس کے جسم کے اندر کروڑوں ننھی ننھی ہستیاں اس طرح گھومتی اور اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔ جیسے وہ کسی بڑے شہر کے گلی کوچوں میں آباد ہوں۔ اسی طرح نفسیات کے علم سے ہمیں ایسے انسانی نفوس کا پتہ چلتا ہے جو منقسم ہو کر ایک دوسرے کے مدِّمقابل بن جاتے ہیں۔ بعض لوگ آن کی آن میں بھول جاتے ہیں کہ وہ کون ہیں۔ اور کبھی کبھی فرد اپنے سے الگ ہو کر کوئی اَور فرد بن جاتا ہے۔ انفرادیت شاید ایک مفید سہل حیاتیاتی سراب ہے۔ وہ ارتقاء کے دوران میں بتدریج ظاہر ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "ہر فرد ایک نوع کا تجربہ ہے جو فطرت کبھی اِن اور کبھی اُن اوصاف کی آزمائش کے لئے عمل میں لاتی ہے۔"

حیاتیات = Biology

منفرد ہستی = individualized being

تیسری بات ولز یہ کہتا ہے کہ میں موجودہ ایچ جی ولز سے بھی ایک جداگانہ ہستی ہوں۔ میں اُس کے ذریعے اس دُنیا میں رہتا سہتا ہوں لیکن پھر بھی میں اُس سے الگ ہی ایک ہستی ہوں اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ علیحدگی کی یہ حس بڑھتی جاتی ہے۔ نہ اُس ایچ جی ولز کا جسم اور نہ اُس کی شخصیت باقی رہنے والی ہے لیکن ہاں خیالات کا پھلتا پھُولتا ہُوا عمل جس کا ہم سب جزو ہیں اور جس کا میں بھی ایک جزو ہوں شاید ہمیشہ ہمیشہ اپنی وسعت اور طاقت میں بڑھتا اور پھیلتا چلا جائے۔" میں سمجھتا ہوں کہ انسان غیر فانی ہے مگر افراد غیر فانی نہیں۔" "شخصیت یا انفرادیت ایک حیاتیاتی ہتھکنڈا ہے جو دورانِ ارتقاء میں اپنا کام پُورا کر چکا ہے اور اب ختم ہونے والا ہے۔ نسل کی غیر فانی رُوح کا شعور جو ہماری اپنی ذات سے زیادہ بلند و بالا ہے، اب وہ ہماری زندگیوں کی سمت نمائی کرنے والا ہے۔"

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بطور افراد کے اپنے خصوصی اوصاف کو دبا دیں۔ "ہمیں انتہائی حد تک اپنے آپ سے کام لینا ہے۔ اُس قابلیت اور اُس انفرادی وسعت کو جو ہمیں وجودِ اعلےٰ یعنی انسانِ اعلےٰ کی ترقی کے لئے عطا ہُوا ہے زندہ در گور کر دینا ایک گناہ ہے۔" "میں اس قسم کا جمہوریت پسند نہیں ہوں کہ اپنی عقل یا ارادے کو 'زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ خوشی' یا اکثریت کے ارادے یا کسی ایسے ہی لغو نظریے پر قربان کر دوں یا اُس کا ایک شمہ بھی یوں ترک کر دوں۔ یہ دُنیا اور اُس کا مستقبل کمزور لوگوں کے لئے نہیں نہ وہ خود غرض لوگوں کے لئے ہے۔ وہ عوام کالانعام کے لئے نہیں بلکہ بہترین انسانوں کے لئے ہے۔ جو آج بہترین ہے وہی کل عام ہو جائے گا۔"

"تاہم" میں معاشرت میں مساوات کا عَلَم بردار ہوں لیکن اس لئے نہیں کہ احمقوں کو مزے اُڑانے میں مدد دوں بلکہ اس لئے کہ میں ترقی کے مواقع سب کے لئے مہیا کرنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کسی شخص کو بھی جس میں کوئی جوہر ہو نظر انداز نہ کیا جائے۔" اس لئے میں "معاشی تبدیلیوں کا مؤید ہوں اور قومیت اور جنگ کا مخالف ہوں۔" "سیاسیات میں میرا مطمحِ نظر ایک کھُلی ہوئی سازش ہے" جو اس سلطنت اور اُس سلطنت غرض سب سلطنتوں کو مٹا کر محض انسان کی عالمگیر سلطنت کی بنا ڈالے!"

" اور میرے لئے فطری بات ہے کہ میں سائنس کا مدّاح ہوں۔ سائنس کی دُنیا میں مَیں اعلےٰ مقاصد کے لئے وُہ بے غرض انہماک پاتا ہوں جو مجھے اُمید ہے کہ ایک روز تمام کے تمام انسانی کاموں میں مصروفِ کار نظر آئے گا۔"

۱۹۳۹ء

دُنیا کی حالت اس وقت تاریک اور خطرناک ہے۔ ہر طرف تشدّد کا بول بالا ہے۔ ہمیں جلد کچھ کرنا چاہئے۔ معاشری طبقات اُلٹ پلٹ ہو رہے ہیں۔ لاکھوں نوجوان بے مقصد اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ اس فضول زائد توانائی کا نتیجہ تشدّد اور انقلاب ہے۔ آج سوسائٹی کی بڑی ضرورت طبقات اور جماعتوں کی از سرِ نو ترتیب ہے۔ تہذیب اگر اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہ بنائے گی تو تباہ ہو جائے گی۔ لوگوں پر غفلت اور سستی طاری ہے۔ وقت نازک ہے اور ایک نئی انسانی سوسائٹی کا قیام قطعاً لابدی ہو چکا ہے۔ سو بدلو یا مر مٹ جاؤ۔"

صبح نو

گزشتہ زمانے سے ہوتا ہوا بقا کا "یہ مسئلہ ہماری زندگیوں میں بھی آیا۔ اپنے بعد آنے والوں کے لئے اِسے ترک کرنے سے پہلے ہم بھی اس مباحثے میں شریک ہو سکتے ہیں اور اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ روشنی کی اس کرن کی مانند ہے جو ایک منشور میں سے ہو کر گزرے جو اُس کا امتحان کرے شاید اُسے منعطف کر دے یا منقطب کر دے اور یوں اُسے کچھ نہ کچھ تبدیل کر کے پھر آگے کو روانہ کر دے ہم ایسے منشور ہیں۔ خیالات ہماری پیدائش سے پہلے موجود تھے اور ہماری موت کے بعد یونہی جاری رہیں گے"۔

"پودے اتنے منفرد نہیں ہوتے جتنے وہ معلوم ہوتے ہیں۔ تم ایک پودے کو لے کر بہت سے پودوں میں تقسیم کر سکتے ہو۔ یہ تقسیم شدہ پودے کیا نئے افراد ہوں گے۔ یا تم ایک کا پیوند دوسرے سے کر سکتے ہو۔ پھر پیوندی پودا کیا ایک نیا پودا ہوگا؟ درخت بھی اتنے منفرد نہیں ہوتے جتنے بظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اسفل قسم کے جانوروں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ان میں سے بعض دفعہ دو مل کر ایک اور بعض دفعہ ایک ٹوٹ کر دو ہو جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اعلےٰ قسم کے جانوروں اور انسانوں میں عموماً یہ صفت نہیں پائی جاتی لیکن کبھی کبھی عجیب و غریب جانور بلکہ آدمی بھی ظہور میں آجاتے ہیں جن کے ایک جسم میں دو سر یا ایک سر کے ساتھ دو جسم ہوتے ہیں۔ پھر ان میں فرد کون ہے؟" سو انفرادیت کچھ ایسی صاف اور واضح حقیقت نہیں ہے۔

"زندگی میں شریک ہونا بھی کس قدر پُر لطف ہے۔ جیسے ایک دھوپ گھڑی صرف روشن ساعتوں کا شمار کرتی ہے اسی طرح زندگی کو بھی صرف یہ خبر ہوتی ہے کہ وہ زندہ ہے۔ زندگی میں ہزاروں تجربے ہوتے ہیں لیکن ایک تجربے سے ہم کبھی شناسا نہ ہوں گے۔ ہم کبھی نہ جانیں گے کہ ہم مر چکے ہیں!

(باقی)

بشیر احمد

صُبحِ نَو

رات بیت چکی، یہ صبح ہے —— کیسی صبح ہے یہ؛
رات کے معنی ہیں یاس کی تاریکی، صبح کے معنی ہیں خوشی کی لہر۔
سو یہ صبح بھی خوشی کا پیام لائی ہو گی؛
نہیں، رات اور دن تو صرف دلوں سے نارِیک و روشن ہیں ورنہ رات اندھیری ہے دن اُجاگر۔
کئی راتیں گزر گئیں مطمئن، کئی صبحیں آئیں اور چلی گئیں خوش خوش۔
پر اب تو راتیں کچھ اور ہیں اور دن کچھ اور۔
محبت کے غم نے، دنیا کے بوجھ نے، تمدن کی حریص جنگ نے اِک چھاؤنی چھائی ہے دل پر!
دل جو کچھ کر نہ سکا آرام کے اندھیرے اور اطمینان کی نیند میں،
اب جاگ رہا ہے حقیقت کے احساس سے دُکھ کی روشنی میں، خوش نصیب!
آرام و غفلت کے خوابِ گراں سے یہ درد و غم کی بیداری اچھی!
رو دینے والا غم نہیں قہقہے مارنے والی خوشی نہیں،
بلکہ وہ سچا درد اپنا اور نوعِ انسان کا جسے اِک صبح روشن آ کر گدگدائے تو وہ
اپنے غموں میں بھی مسکرا دے اپنے اور سب کے لئے!
ایسی ہے یہ صبحِ نَو!

ل ب

غزل

والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیعؔ فرزند حضور نظامِ دکن و برار

اب صرف بے حسی پہ مدارِ حیات ہے
جب سے گئے ہیں آپ نہ دن ہی نہ رات ہے

تیرا کرم مِٹا نہ سکا میری کائنات
دِل مِٹ گیا تو غم ہی مری کائنات ہے

مایوس ہو گئے ہیں تری بے رُخی سے ہم
اب تیری بے رُخی نگہِ التفات ہے

دل پر تمہاری یاد نے کِتنے سِتم کِئے
کیا پُوچھتے ہو یہ کوئی کہنے کی بات ہے

جب اُس نے قیدِ غم میں رکھا ہے ہمیں شجیعؔ
کیوں ہم کو قیدِ غم سے اُمیدِ نجات ہے

ہماری زبان

سب سے بڑھ کے ہماری بولی ۔۔۔ پیاری پیاری بھولی بھولی
اور زبانیں سیٹھی سیٹھی ۔۔۔ اُردو ہماری میٹھی میٹھی
ہلکی پھُلکی اور رسیلی ۔۔۔ بانکی ترِچھی اور نکیلی
چھوٹے بڑے کی زباں پر چڑھ کر ۔۔۔ پھیل گئی تو کیسی گھر گھر
تیرے حُسن کا پھر کیا کہنا ۔۔۔ فارسی تازی تیرا گہنا
تیری فصاحت سب سے بڑھ کر ۔۔۔ تیری بلاغت سب سے بڑھ کر
تیرا بیاں ہے سب سے نرالا ۔۔۔ کوثر میں ہو جیسے کھنگالا
پیارے پیارے بول ہیں تیرے ۔۔۔ فقرے کیا انمول ہیں تیرے
تیری شوخی، تیری متانت ۔۔۔ تیری نزاکت، تیری حلاوت
تیری ملاحت، تیری صباحت ۔۔۔ تیری لطافت۔ ایک قیامت
نثر ہے تیری نثرِ نثرے ۔۔۔ نظم ہے تیری نظمِ ثریّا
طرزِ ادا پر قدرت تیری ۔۔۔ اُف ری اُردو وسعت تیری!
سرسیّد کی راج دُلاری ۔۔۔ حالی اور آزاد کی پیاری
شبلی کی تو آنکھ کا تارا ۔۔۔ ماجد کے تو دِل کا سہارا
دفتر اور دربار کی اُردو ۔۔۔ شرر کی اور سرشار کی اُردو

شاد کی اور خیال کی اُردو اکبر اور جلال کی اُردو
راشد اور نذیر کی اُردو ناسخ اور اسیر کی اُردو
مضطر اور ریاضؔ کی اُردو نوح کی اور نیاز کی اُردو
میر اور غالب تیرے ثناخواں داغ و امیر سے تیرے حُدی خواں
میر حسن کی گود کی پالی میر انیس کی سانچے میں ڈھالی
دل کو ظفر کے لبھانے والی نائیڈو تک کو رجھانے والی
گاہک شیخ و شاب ہے تیرا مارا ہُوا پنجاب ہے تیرا
دل اقبال کا تُو نے چھینا اُف ری ہندوستاں کی حسینہ!
حسرت کو سجاد کو مارا واسطی کو ناشاد کو مارا
پریم کو اور سرور کو لُوٹا کوہِ الم اِک اُن پہ ٹُوٹا
شیخ پہ تُو نے جادُو ڈالا اپنا کیا اُس کو متوالا
عاشق اِک نیرنگ ترا ہے اُس کو بھی تُو نے مار رکھا ہے
مار لیا اعجاز کو تُو نے لُوٹ لیا شہباز کو تُو نے
فانی اور جگر کو مارا وحشت اور نظر کو مارا
شوق، عزیز، نسیم، ہمایوں انشا، امانت، جرأت، ممنوں

تیرے رہے وہ مرتے مرتے
گئے تجھے وہ یاد ہی کرتے

سید نذیر حسین ناشاد

نوٹ :- چشم بددُور اردو کے چاہنے والوں کی تعداد اتنی ہے کہ اُن سب کے ناموں کو ایک نظم میں کھپانا کم سے کم میری طاقت سے باہر تھا۔ جو کچھ ہو سکا حاضر ہے۔

بالکل فیل

ناہید کے ہاں گئے کئی دن گزر چکے تھے۔ ذراسی بات تھی مگر آخر دل ہی تو ہے۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ جس نے مجھے گالی دی اُسے ناہید نے کیوں نہ ڈانٹا۔

ناہید عمر میں مجھ سے کہیں بڑی ہیں مجھے تو ان کی شادی بھی یاد نہیں شاید ابھی سکول داخل بھی نہیں ہُوا تھا کہ علاؤالدین صاحب سے ان کی شادی ہوئی۔ علاؤالدین المعروف بہ علّو سے میرا دُور کا رشتہ بھی ہے اور یہ دونوں تو میرے ہوش سے پہلے کے رشل سٹار ہیں۔ میں تو پہلے بھابی کہہ کر ڈرتے ڈرتے ان کے گول کمرے میں داخل ہوتا تھا مگر علّو صاحب کی ایک ہی ڈانٹ سے سبق آگیا۔ فرمانے لگے "غریب کی جورو سب کی بھابی" والا قصہ مت شروع کرو۔ اوّل تو میں غریب نہیں اور دوم میں رشتہ داری کی بنیاد پر تپاک کے خلاف ہوں۔ ناہید پکارو۔

اب میری عمر بائیس سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ اور مجھ میں کوئی خوبی ہو نہ ہو بدتمیز نہیں ہوں، بدمزاج نہیں ہوں۔ اس گھر کی شفقت نے گزشتہ دو سال جو میرے دل پر اثر کیا وہ میرے اس فقرے سے ظاہر ہے جو دو ماہ ہوئے ایک بھری محفل میں میری زبان سے نکلا۔

"اِس دنیا میں اگر انسانیت اور اعلیٰ درجہ کی انسانیت ہے تو ناہید کے گھر میں"

اس پر ناہید کی دو ایک حاسد خاتونوں کے تیور بدلے، اشارے بھی ہوئے مگر مجھے کیا پروا تھی۔ اس فقرے کے دو ہفتے بعد مجھ سے کسی نے کہا "فریفی! سنا ہے ناہید نے ایک نایاب چینی کُتا پالا ہے" میں فوراً بول اُٹھا "نہیں تو۔ ابھی تو وہاں سے آرہا ہوں!" یہ جواب سُن کر وہ تو کچھ مسکرا سا دیا اور میں کسی اور سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔

اس کے ایک ہفتے کے بعد ناہید اور وہی حضرت باغ میں ٹہل رہے تھے کہ میں جا نکلا۔ ناہید سے باتیں ختم ہوئیں تو وہ حضرت کافی بلند آواز سے (جو میرا خیال ہے ناہید نے ضرور سُنی) مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے "فریفی! تم بغیر سیٹی کے بھی آجاتے ہو؟" ایسا کودن نہیں کہ اس چوٹ کو نہ سمجھتا۔ ہنس کر یہی جواب دیا "حضرت! چینی کُتے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستانی کی طرح بھونکتا نہیں۔" اُن سے تو بات رفت گزشت ہو گئی مگر ملال رہا کہ ناہید سب کچھ سمجھتے ہوئے کچھ نہ بولی۔ آج چھ تاریخ ہے کہ زندگی وبال ہے۔ جاؤں تو اتنے دن نہ جانے کا کیا سبب بیان کروں؟ سچ بولوں تو ذلیل ہوں۔ ناہید اگر سمجھی ہو تو کیوں وہ میری طرفداری کرتی۔ نہ جاؤں تو زندگی زہر ہے۔ اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی ہوئی۔ اُچک کر ریسیور

کو سنبھالا۔ ناہید کی آواز تھی۔ آداب کیا۔ فرمانے لگیں "رُوٹھے بیٹھے ہو؟" جواب میں عرض کیا "جی نہیں! کیا مجال؟"۔ "تو آ نکلو نا"۔
"جی بہت بہتر۔ کب؟"۔ "ابھی"۔ اسی لفظ پر دوسری طرف ٹیلیفون بند کر دی گئی۔ بندہ سوٹ نکٹائی بدل جا وارد ہُوا۔

(۲)

گھر میں داخل ہوتے ہی سخت حیران ہُوا۔ ناہید کے گھر اگر پارٹی ہو تو نفاست کا عطر ہوتی تھی مگر آج تو عجب بے ہنگم سا مجمع تھا۔ کوئی ادھر بھاگ رہا ہے کوئی اُدھر۔ شور ہے۔ اجنبی سے چہرے، غیر مانوس آوازیں اور غیر ضروری طور پر بلند۔ گھر کا نقشہ ہی بدلا ہُوا تھا۔ ناہید کے باغ میں بیٹھنا چلنا پھرنا زندگی کی شان کو دوبالا کرتا تھا اور آج یہ حالت تھی کہ بوکھلاہٹ، اضطراب، بے معنی چیخ پکار۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ناہید کہیں نظر نہ آئیں، آخر دو ایک بے تکلف دوست ایک طرف الگ کھڑے تھے ان کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ دو قدم پرے ہی تھے کہ پیچھے سے ناہید کی آواز سنائی دی۔

ناہید۔ فریغی! تم آ گئے۔ جلدی ادھر آؤ۔

فریغی۔ جی ہاں۔ ارشاد!

یہ کہہ کر اُن کی طرف بڑھا کہ ایک عجب قسم کی ساڑھی اُن کے پہلو میں آ جھکی۔

ناہید۔ فریغی! شکّو سے ملو اور جلدی ان کے ساتھ جاؤ۔ برج فور (bridge four) بناؤ۔

ابھی شکّو کی طرف سر جھکایا ہی تھا کہ ناہید یہ جا وہ جا اور میں سخت شش و پنج میں کہ اس پوڈر کریم ساڑھی کو مس کہوں یا صرف شکّو کہ وہ ذاتِ شریف بے تکلف میرے بازو میں بازو ڈال مجھے ایک طرف جہاں تاش کی میز تھی کشاں کشاں لے گئی۔ فوراً دو اَور نوجوان کہیں سے آ گئے اور پیشتر اس کے کہ مَیں کچھ بولوں ایک اُن میں سے کہتا ہے: "آپ اور شکّو۔" شکّو کی ڈیل (deal) شکّو نے تاش تقسیم کیا۔ بغیر پوری طرح دیکھے کہنے لگی "تھری نو ٹرمپ"۔ سب نے پاس کر دیا۔ میرے پاس تو کچھ نہ تھا مگر کیا لاجواب کھیلی کہ اُن لوگوں کے دو یکّے دھرے کے دھرے رہ گئے اور شکّو تین نو ٹرمپ بنا کر خوب اُچھلی کودی۔ پھر تاش تقسیم ہُوا۔ اب کے وہ حضرت تھری no trump بولے۔ میں نے پاس کیا۔ اُن کے ساتھی نے پاس کیا۔ شکّو بجائے اس کے کہ کچھ بولے، جھنجلا کر اُٹھ بیٹھی۔ اپنے پتّے غصّے سے اُٹھا کر دُور پھینک دیئے اور تاش تقسیم کرنے والے کو مخاطب کر کے بلند آواز سے بولی "جھوٹا۔ بے ایمان۔ فریبی۔ چاروں اِکّے خود رکھ لئے" اور یہ کہہ کر چاروں اِکّے اس کی کہنی کے نیچے دبے ہوئے کھول دیئے۔ وہ کچھ بڑبڑانے لگا کہ شکّو میری طرف جھکی۔ "دو نہ ایک مُکّا!" مَیں کچھ نہ بولا تو غضب کی مسکراہٹ سے کہنے لگی "لڑتے نہیں تو آؤ میرے پیچھے بھاگو فوراً"۔ یہ کہہ کر وہ تو بھاگی۔ میں بھی اس کے تعاقب میں بھاگا مگر دل میں حیران تھا کہ یا اللہ کس پاگل سے پالا پڑا ہے۔

شکّو بلا کی پھرتیلی نکلی۔ تین چکر اس نے مجھے اِدھر اُدھر دیئے، تب جا کر کہیں قابو میں آئی مگر جونہی میں نے اسے پکڑا۔

اس زور سے چیخی کہ خدا کی پناہ۔ کوئی دس آدمی مجھے چمٹ گئے۔ میرا سانس پھولا ہُوا۔ نکٹائی بکھری ہوئی، واسکٹ کا ایک بٹن کسی نے گھسیٹ لیا کہ ناہید آئیں اور کہنے لگیں "خوب بھاگے فریفی۔ اب جلدی گھر جاؤ۔ کھانے کے بعد ضرور ساڑھے نو بجے پہنچ جانا۔ کچھ انگریز کھانے پر آ رہے ہیں۔ کھانے کے لباس میں آنا۔ افسوس ہے میز پر جگہ نہیں۔ جلدی کرو"۔

میں۔ "اجازت ہو تو یہاں نہ آؤں۔ شکّو کو کھانے پر اور فلم پر لے جاؤں"۔

ناہید۔ جی نہیں۔ یہاں آنا ہوگا۔ حکم ہے۔ سمجھے، اب جلدی جاؤ۔ (مسکرا کر) تمہارا انتظار کروں گی"۔

(۳)

کھانے کے بعد پہنچا تو شام سے زیادہ حیران ہُوا۔ ناہید کے ہاں انگریزوں کا کھانا ہو تو کبھی آٹھ دس سے زیادہ مہمان نہیں ہوتے۔ میں عین اس وقت پہنچا جب مرد کھانے کے کمرے سے نکل کر گول کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ عجیب قسم کے انگریز نظر آئے۔ گول کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک نہیں تین چار نے بلند آواز سے کہا" Let's have a dance"۔ یہ کہا اور ڈانس شروع ہو گیا۔ میں ناہید تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ شکّو خود بخود میرے ساتھ ناچنے کے لئے تیار ہو گئی۔ کسی نے گراموفون بھی شروع کر دیا اور عجیب قسم کا ناچ وہیں گول کمرے میں شروع ہو گیا۔ یعنی پاؤں کا کھلنا، کندھوں کی ٹکریں، معافیاں، ہنسی، دھکے۔ میں شکّو سے پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے کہ گراموفون ریکارڈ ختم۔ ناچ ختم اور شکّو کسی اَور کے ساتھ سرگرم گفتگو۔ مجھے غصّہ آیا مگر رسمی طور پر سر شکّو کی طرف جھکا دیا۔ اتنے میں گراموفون پھر شروع ہُوا۔ اب کے ناہید نے میرے ساتھ ناچنے کی کوشش کی۔ مگر جگہ ہوتی تو کوئی ناچتا۔ وہی دھکے، وہی کندھوں کی ٹکریں، پاؤں کا کھلنا۔ ناہید بولیں، یہاں تو وہ ناچے جس کے پاؤں لوہے کے ہوں۔

ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ وہ سب انگریز گڈ بائی، گڈ نائیٹ کا شور مچاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ ناہید سے ایک آدھ نے آداب اور شکریہ کہا اور باقی بدتمیز تو اُچھلتے کودتے یہ جا وہ جا۔ میرا غصّہ کے مارے بُرا حال تھا کہ ناہید نے بہت پیاری طرح کہا۔

ناہید۔ فریفی ڈارلنگ۔ خفا نہیں ہوتے۔ کل شام ساڑھے چھ بجے آنا۔ میں سب کچھ تمہیں بتا دوں گی۔ پکّا وعدہ کرو۔

میں۔ جی ہاں۔ ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ مگر میرا دماغ چکرا رہا ہے۔

ناہید۔ کتنے خود پرست ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ میرا کیا حال ہوگا۔ تم سے کہیں زیادہ نازک مزاج ہوں مگر زمانہ سب کچھ سکھا دیتا ہے سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ کل ضرور آنا۔

میں۔ جی ہاں۔ آداب۔

(۴)

دوسرے دن شام ساڑھے چھ بجے پہنچا تو یوں معلوم ہُوا کہ ناہید کا گھر اپنی پُرانی آب و تاب سے زندہ ہے۔ ناہید ایک لاجواب

ساڑھی پہنے غیر معمولی طور پر مجھے دروازہ پر تپاک سے ملیں۔ فرمانے لگیں "گول کمرے کے اندھیرے کا خیال نہ کرو۔ میں نے خاص تمہارے لئے فلم تیار کرائی ہے۔ آؤ دیکھو"

چپکے سے اندر داخل ہُوا، روشنی تو نہ تھی مگر یوں معلوم ہُوا کہ علّو صاحب اور ایک خاتون کمرے میں موجود ہیں۔ اور کوئی نہیں۔ فلم شروع ہوئی۔ فلم ختم ہوگئی۔ لکچر شروع ہُوا۔ لکچر ختم ہوگیا۔ لکچر دینے والی شکو تھی۔ شرم کے مارے غرق ہوگیا۔

(۵)

مجھے ہمیشہ سے ناز تھا کہ میرا لباس اچھا ہے، میری گفتگو دلچسپ ہے۔ میرا اُٹھنا بیٹھنا شاعرانہ ہے۔ فلم صرف یہ تھی کہ کل شام کھانے سے پہلے اور بعد کیا ہُوا اور اس میں میرا نادانستہ حصّہ کیا تھا۔ فلم کو دیکھ کر رو دیا۔ مجھ سا بھدّا، مجھ سا کریہہ منظر کوئی نہ تھا۔ وہ شکو جسے میں زندگی میں چنداں قابلِ توجہ نہ سمجھتا تھا مشہور مس فسونہ نکلیں۔ اُن کے بھاگنے میں لطف تھا۔ میرا تعاقب ایک بھدے بیل کے اُچکنے سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ اس نے تاش پھینکے تو ادا سے، چیخی تو ناز سے اور فریفی جب لپٹے ہوئے آدمیوں سے چھٹکارا کرانے میں مشغول تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ شریف آدمی نہیں بازاری شہدا ہے۔ اگر فلم کا معیار صحیح ہے تو میں زندگی کے ہنر میں بالکل فیل ہُوا۔

لکچر میں مس فسونہ نے صرف یہی کہا کہ لوگ ہمارے ہُنر کی تعریف کرتے ہیں تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ کمال کیا ہے کہ ایکٹنگ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ فلم صرف اس لئے طیار کی گئی ہے کہ بغیر ایکٹنگ کی تعلیم کے انسان کو چلنا پھرنا نہیں آتا۔ بات کرنا تو دُور رہا، آپ خود دیکھ لیں کہ ایک مشہور فیشن ایبل نوجوان نہ کرسی پر بیٹھنا جانے نہ بھاگنا جانے نہ ناچنا۔ پیار کرنا تو خیر بہت مشکل ہے۔

(۶)

رخصت ہونے سے پہلے ناہید سے صرف یہ پوچھ سکا "ناہید یہ سب خرچ تم نے صرف اس لئے کیا کہ مجھے بیوقوف ثابت کرو؟"

ناہید۔ صرف اسی لئے۔ مگر ایک مطلب اور بھی تھا۔

فریفی۔ وہ کیا؟

ناہید۔ عورت کو بیوقوف مرد عقلمند مرد سے کہیں زیادہ پسند ہے۔ فسونہ میری رشتہ میں بھانجی ہے۔ فسونہ! آؤ۔ مسٹر فریفی سے ملو۔ یہ علّو کے بھانجے ہیں۔

(۷)

میں قائل ہوں کہ فسونہ زندگی میں ایکٹنگ سے کہیں زیادہ پیاری ہے۔ مگر کیا فریفی اس کے قابل ہے؛ وہ کہتی ہے

کہ اسے بیوقوف پسند ہیں مگر کیا یہ اس کا اکیٹنگ نہیں ؛ کیا میں محض بیوقوفی کی بنیاد پر بہشت میں جا رہا ہوں ؛ ممکن ہے۔ یہ قسم کھاتا ہوں کہ بہشت ہو کہ نہ ہو فسونہ ضرور حور ہے۔

(۸)

بات تو ختم ہو چکی ہے مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج کل کی حوریں چالاک ضرور ہیں۔ جب پوری بے تکلفی ہو گئی تو ایک دن فسونہ سے پوچھا کہ تم نے تاش کا وہ لاجواب کھیل کیسے کیا ؛

فسونہ۔ واللہ پورے گھامڑ ہو۔ چپکے سے ان دونوں نے مجھے میز کے ایک طرف اپنا ہاتھ کر کے تمام پتے دکھا دیئے پھر کیا مشکل تھی۔

میں۔ اور وہ چار اِکّوں والی بات ؟

فسونہ۔ (بے اختیار ہنس کر) وہ مرد مرد نہیں جو اندھا نہ ہو۔ اِکّے تو میں نے خود الگ رکھ لئے تھے۔ جب وہ تقسیم کر چکا تو اسے کیا پتہ کہ اس نے بارہ پتّے تقسیم کئے کہ تیرہ۔ میں نے شور مچایا۔ اپنے پتے پھینکے اور اس گھبراہٹ میں اس کی کہنی کے نیچے چار اِکّے رکھ دیئے اور اس کے تین پتے اٹھا لئے۔

میں۔ یہ بے ایمانیاں بھی تمہیں آتی ہیں ؛

فسونہ۔ ابھی تو سیکھ رہی ہوں مگر پیارے شادی کر کے لڑکیاں بدل جاتی ہیں۔

میں۔ یوں ہی سہی مگر سچ سچ بتاؤ کہ کیا میری بیوقوفی اور میرا اندھاپن ہی میری سفارش ہیں یا مجھ میں کوئی خوبی بھی ہے ؛

فسونہ۔ مجھے چینی کتوں سے محبت ہے بھونکتے نہیں۔

فلک پیما

ہمسایہ

ایک اچھا ہمسایہ ایک بیش بہا موتی ہے ــــــــــــــ (فرانسیسی)

اگر کوئی اپنی حقیقت کو اچھی طرح جاننا چاہے تو وہ اپنے ہمسایہ کو خفگی میں مبتلا کر دے ــــــ (جرمن)

ہر شخص کا ہمسایہ اس کا آئینہ ہے ــــــــــــــ (انگریزی)

ــــــــــ محمد کمال احمد ناز بھاگلپوری

عرفانِ شاعر

اے کہ تُو اور مجھ تک آنے کی لگن
اے کہ تُو اور مجھ کو پانے کی لگن

اے کہ تُو میرے سمجھنے پر مُصر
اور مُصر بھی حد سے کچھ بڑھ کر مُصر

اے کہ تجھ کو میری جُست وجو کی دُھن
میری جُست وجو کی بابت مجھ سے سُن

مَیں ازل کا شاعرِ صاحب شعُور
تُو شعورِ ابتدائی سے بھی دُور

مَیں زباں داں، مَیں مفکّر، مَیں حکیم
تیری دانش اور زباں دونوں سقیم

مَیں وسیع القلب اور تُو تنگ دل
میں رحیم الطبع اور تُو سنگ دل

تو فقط اِک قطرہ میں زخّار یم
تجھ کو صرف اپنا، مجھے دُنیا کا غم

میری ہمدردی محیطِ دوسرا
تیری ہمدردی سے خارج ماسوا

تیرے سر صرف ایک اپنے دم کا بار
میرے سر اِک خلق، اِک عالم کا بار

تو زمیں پر، میں فرازِ آسماں
غور فرما، تُو کہاں اور مَیں کہاں

اس سے ظاہر ہے، یہ تیری سعیٔ کار
کر نہیں سکتی ہے تجھ کو کامگار

کاش! کوئی تجھکو یہ سمجھا سکے
کاش! تُو اِس پر تنبّہ پا سکے

اس قدر فرقِ اہم رکھتے ہوئے
اِس قدر فصلِ بہم رکھتے ہُوئے

ہر طرح تیری پہنچ مجھ تک محال
اور ورائے ہر گمان و شک محال

رائگاں تیری یہ خواہش رائگاں
رائگاں، یہ سعیٔ و کاوش رائگاں

پر جو اِس پر بھی تجھے اصرار ہے
اور میری معرفت درکار ہے

مجھ تک آنے کے لئے بے تاب ہے
مضطرب ہے، بے خور و بے خواب ہے

بے مرے ہاتھ آئے جی سکتا نہیں
بے یہ مقصد پائے جی سکتا نہیں

مجھ تک آ سکنے کا رستہ مجھ سے پُوچھ
مجھ کو پا سکنے کا رستہ مجھ سے پوچھ

ذیل کی راہوں سے چل کر مجھ تک آ
اِس ہدایت نامے کو رہبر بنا

مجھ کو میرے عیش و عشرت میں نہ ڈھونڈ / مجھ کو میرے رنج و کلفت میں نہ ڈھونڈ
میری طرزِ زیست سے مجھ کو نہ جانچ / میری ہست و نیست سے مجھ کو نہ جانچ
میرے دُکھ کا ناقص اندازہ نہ کر / میرے سُکھ کا ناقص اندازہ نہ کر
مجھ کو اپنی طبع کے گز سے نہ ناپ / مجھ کو اپنے سنگِ ناقص پر نہ چھاپ
جستجوئے خام سے کیا فائدہ / اِس غلط اقدام سے کیا فائدہ
میرے خاکی جسم کے اعمال سے / میرے ظاہر حال، ظاہر قال سے
تُو نے مجھ کو جاننا چاہا تو کیا / اِس طرح پہچاننا چاہا تو کیا
جسمِ خاکی تو فقط اِک سایہ ہے / ہیچ ہے، بے اصل ہے، بے مایہ ہے
تُو جو اِس سایہ تک پہنچا تو کیا / سایۂ بے مایہ تک پہنچا تو کیا
یوں تو میں کچھ اور بھی کھو جاؤنگا / اور تجھ سے دُور تر ہو جاؤں گا

میرے بحرِ طبعِ ناساکن کو دیکھ / میرے ظاہر پہ نہ جا، باطن کو دیکھ
مجھ کو میری فطرتِ والا سے پُوچھ / مجھ کو میری ہمّتِ بالا سے پُوچھ
مجھ کو میرے بے ریا سینے میں دیکھ / مجھ کو میرے دل کے آئینے میں دیکھ
مجھ کو میری حق گزاری سے سمجھ / مجھ کو میری ذمّہ داری سے سمجھ
مجھ کو میری دردمندی سے پرکھ / مجھ کو میری غم پسندی سے پرکھ
مجھ کو میری باطنی سیرت سے جانچ / مجھ کو میری رُوح کی قیمت سے جانچ
مجھ کو میرے کام کی میزاں میں تول / سعیٔ خیرِ تام کی میزاں میں تول
مجھ کو میرے شعر کی دُنیا میں ڈھونڈ / مجھ کو میری جنّت الماویٰ میں ڈھونڈ
سعی و کوشش سے مرے دل تک پہنچ / میرے دل سے میری منزل تک پہنچ
اِس طرح ممکن ہے، کچھ ہاتھ آسکے / اس طرح شاید مجھے تو پا سکے

ورنہ تا محشر مرا ملنا محال
ہیں تو میں، میرا پتا ملنا محال

آزاد انصاری

اُداس پرندہ

اُداس شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے نے
بجھا دیا ہے دِیا دن کی زندگانی کا
خموش پیڑ پہ بیٹھے ہوئے حزیں طائر
عجیب وقت ہے یہ تیری نوحہ خوانی کا
تری نگاہ میں رقصاں ہیں وہ حسین صُبحیں
کہ جن کا رنگ تھا غازہ رُخِ جوانی کا
تڑپتے تھے جو کبھی ولولے ترے دل میں
تو چُوم لیتا تھا مُنہ سطحِ آسمانی کا
نہ ہم صفیر ہیں باقی نہ اب وُہ گیت ترے
تُو ایک باب ہے اس دُکھ بھری کہانی کا
فضا خموش و فسُردہ ہے اے حزیں طائر
تو چھیڑ ایسے میں اِک نغمہ شادمانی کا
اُداس شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے نے
بدل ہی ڈالا ہے نقشہ جہانِ فانی کا

ناجور سامری

یاد

سولہ برس ہوئے ہیں کہ تم جانِ حُسن تھے
سولہ برس ہوئے ہیں کہ نامہرباں تھے تُم
سر میرا آج بھی ہے تمہارے قدم پہ گو
سولہ برس ہوئے ہیں کہ کچھ سرگراں تھے تم

گو میں وہی ہوں پر وہی حالت نہیں رہی
بیتابیاں نہیں ہیں مرے دل میں درد ہے
کچھ بھول سی ہے سوچ میں رہتا ہوں رات دن
اِک بوجھ سی ہے زندگی۔ امید سرد ہے

پھر وُہ نگاہِ لطف! کہ جو بھولتی نہیں
مدت دراز درد کی سب بھول جائے گی
بلبل ہوا میں جھوم کے پھر گیت گائیں گے
رنگیں فضائیں ہوں گی زمیں مسکرائے گی

سید جمیل واسطی

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

Photo.-R.R. Bhardwaj.

وہ کسان شہزادی

وہ کسان شہزادی

ایک شہزادی تھی، بڑی خوبصورت، سات سمندر پار ایک جزیرہ تھا، دور، بہت دور۔ وہاں ایک مدت سے شہزادی اپنے پلنگ پر پڑی سو رہی تھی۔ اُسی شہزادی کی تلاش میں ہماری کہانی کا شہزادہ سرگرداں تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُسے اپنی دُلہن بنا سکے گا۔ پھر وہ مسکرایا کرے گی، اُس کے مُنہ سے پھول جھڑا کریں گے۔

شہزادہ اتنی دُور کیوں جا رہا تھا؛ اُس کی اپنی سلطنت میں کیا ایسی ایک بھی لڑکی نہ تھی جو اُس کے سپنوں کی رانی بن سکتی؛ آج وہ شہزادہ کہاں ہے؛ وہ اپنی سلطنت میں لوٹ آیا ہے یا سمندروں کے سینوں پر بھٹکتا پھرتا ہے؛ آج وہ ہمارے گاؤں میں آ جائے اور چھلو کا سرسوں کے پھول کو شرمانے والا مکھڑا دیکھے اُس کے گیت سُنے تو وہ کہہ اُٹھے "اے کسان شہزادی، دھرتی کی بیٹی! میں تجھے پیار کرتا ہوں، آج سے سات سمندر پار کی اُس نامعلوم شہزادی کو کبھی یاد نہ کروں گا"

نام ہے کوشلیا، مگر پیار سے ماں اُسے چھلو کہہ کر بلاتی ہے، اُس کی سہیلیاں بھی اسی نام سے بُلاتی ہیں اور میں بھی بسنت پنچمی کے دن میں اُس کے گھر گیا تھا تو اُس نے مجھے پانچ چھ گیت سُنائے۔ اُس کا چاند سا مکھڑا کتنا معصوم نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا تھا "چھلو اَب سیانی ہو رہی ہے"۔

"اودوں کیوں نہ آیا مترا، جد رنگ سی سرھوں دے پھُل ورگا؛ ـــــ تب کیوں نہ آیا او دوست! جب میرا رنگ سرسوں کے پھول کا سا تھا؛ ـــــ چھلو گا رہی ہے۔ کیا وہ ہماری کہانی کے شہزادے کو تو مخاطب نہیں کر رہی!

مجھے وہی گیت پسند آتے ہیں جن کی جڑ دھرتی میں گہری چلی گئی ہو، جن سے گاؤں کی دلی کیفیت کا پتا چل سکتا ہو، سیپی کے سینہ میں جیسے موتی پروان چڑھتا ہے گاؤں کے سینہ میں گیت پلتے ہیں۔ گاؤں کی دُلہن اور بیٹی، جن پر خود موسیقی و شاعری کی دیویاں خوشی خوشی اپنے جوہر لُٹا دیتی ہیں، اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں پیار کا اتھاہ ساگر چھپائے، آج کے ترقی پسند ادیب کا تعارف وطنیت کی زوردار لہر سے کراتی نظر آتی ہیں۔

ٹیگور نے کہیں لکھا ہے "ہم لڑکھڑاتے پتے ہیں، ہماری سرسراہٹ طوفان کا جواب ہے، مگر تم چُپ چاپ کون ہو؟ میں صرف ایک پھول ہوں!" چھلو بھی ضرور ایک پھول ہے، اپنی ماں کے گھر میں، اور خاص کر تنجن نامی کی اُس محفل میں، جہاں گاؤں کی لڑکیاں باہم مل کر چرخہ کاتنے بیٹھتی ہیں۔ ہاں، وہ چُپ چاپ نہیں رہتی۔ وہ گایا کرتی ہے، شرمانے لگ جاتے۔ ایک دن اُس کی

شادی ہوگی، اور اُس کی ماں اُسے پُکار کر کہے گی "مُنڈا اوکیھ لَے سرہوں دے پھُل ورگا، اگتے تیرے بھاگ لچھیئے!"— سرسوں کے پھول سا دُولھا دیکھ لے، پھر آگے وہی ہوگا او لچھی، جو تیری قسمت میں بدا ہے!— یہ لچھی کون تھی؟ اس سے ہمیں زیادہ سروکار نہیں۔ لچھی اور چھلو میں مَیں زیادہ فرق نہیں سمجھتا۔ آج چھلو یہ گیت خود گا رہی ہے، اُس کی سہیلیاں سُر میں سُر ملا کر اُس کا ساتھ دے رہی ہیں، مگر سوال تو صرف اتنا ہی ہے کہ کیا چھلو کی ماں اُس کے لئے سرسوں کے پھول سا دُولھا ڈھونڈ بھی سکے گی یا نہیں!

پیدائش، شادی، موت۔ کیا یہاں تک ہی زندگی کی دوڑ ہے؛ جو ہو ابھی تو چھلو پر جوانی دیوانی چھا رہی ہے۔ اپنی ماں کے گھر میں وہ آرام کے دن گزار رہی ہے۔ خوشی اور تعجب کے ملے جُلے تأثرات سے پیدا ہونے والے گیت ہمیشہ اُس کے ہونٹ چوما کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ دِل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگتی ہے۔ دھڑکتے دل سے وہ گیت کے الفاظ دُہراتی ہے..... 'سرسوں کے پھول سا دولھا دیکھ لے'..... 'پھر آگے وہی ہوگا او لچھی!'..... 'جو تیری قسمت میں بدا ہے!'..... مستقبل کا خیال اُس کے دل میں عجب پریشانی پیدا کر دیتا ہے۔ ٹھیک ہے، دولھا بڑا خوبصورت ہی ہو تو اس سے کیا بنتا ہے؛ نہ وہ اُس کے مزاج سے واقف ہوگی، نہ اس کے سلوک سے۔ ماں باپ کو چھوڑنا پڑے گا، ساس نند کے بس میں رہنا ہوگا۔ اس پر بھی اگر دُولھا دُلھن کے معیار پر پُورا نہ اُترے تو عمر بھر کا رونا!

'جو بندھ گیا سو موتی!' سماج کہتا ہے۔ شادی ضروری ہے۔ لڑکی کو والدین کا گھر چھوڑ کر سُسرال میں جا کر رہنا ہی ہوگا۔ مگر چھلو گا رہی ہے "مُنڈے آپنے تھائیں رہندے، نی دِھیاں کیوں بنائیاں ربّ نے؟"— 'لڑکے اپنی اپنی جگہ رہ سکتے ہیں۔ ہائے ری! خُدا نے لڑکیاں کیوں پیدا کیں؟'— سینہ بہ سینہ چلا آنے والا یہ دیہاتی گیت اُس کی سوانحمری کا ورق بن گیا ہے۔

چھلو چرخہ کات رہی ہے، اور سوچ رہی ہے کہ ایک دن اُسے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ دینا ہوگا۔ "نکّے چھڈ ونگی کنک دے تیرے رکھ لے کُوآری بابلا!"— 'میں تمہارے گیہوں کے کھیتوں کو سیراب کیا کروں گی، ابّا جان! مجھے کنواری ہی رہنے دو!'— وہ گا رہی ہے اور دیہاتی گیت کے دھیمے سُر تنجن کی ہر ایک لڑکی کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگے ہیں۔

چھلو کے گیت چھلو تک محدود نہیں۔ ہاں، گیتوں کے انتخاب میں اُس کا رُجحان ضرور نظر آ جاتا ہے۔

پنجابی شعر و نغمہ کی زبان ہے۔ صدیوں سے پنجابی گیت زندہ ہیں۔ مَیں سوچتا ہوں کہ جب تک پنجاب کے میدانوں میں دریا بہتے ہیں، اِس کے کھیتوں میں گیہوں اور باقی اناج پیدا ہوتے ہیں، اور جب تک تنجن میں عورتیں باہم مل کر چرخہ کاتتی ہیں، یہ گیت مر نہیں سکتے۔ خاص کر وہ گیت جنہیں سُن کر بچپن کے سپنے جاگ اُٹھیں، جن کی طراوت دھرتی کی ہریاول اور دریاؤں کی روانی سے مل کر بنی ہے۔

ہمارے گاؤں میں گیتوں کا کال نہ ہُوا ہے، نہ ہوگا۔ چھلو کے مزے دار گیت چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کی محفل میں ایک نئی رونق،

نئی رنگینی پیدا کر دیتے ہیں۔ خدا کی عالم خلقت کے بنیادی ترنم اپنی آپ بیتی سُنا کر ہمیں زندگی اور موت کے دوراہے پر لا پہنچاتے ہیں۔ دیہاتی گیتوں کا خمیر اکثر چرخہ کی "گھُوں گھُوں" سے مل کر بنا ہے۔

"چرخے دی گونج سُن کے، جوگی اُتر پہاڑوں آیا!"

—"چرخے کی گونج سُن کر جوگی پہاڑ سے نیچے اُتر آیا" گیت کی مختصر سی زمین میں نہایت کفایت سے کام لیا گیا ہے۔ عورت کی شاعری کی یہ مُنہ بولتی تصویر فنی لحاظ سے ایک کامیاب چیز ہے۔ کون جانے یہ گیت پہلے پہل کس کی زبان سے نکل پڑا تھا؛ جو کہ اسے گاتی ہے تو اس میں اپنے دل کی آواز ملا دیتی ہے۔ عورت کا یہ گیت ہر ایک دوشیزہ کے غرورِ حُسن میں ایک نئی چمک پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ وہ حسینہ ہے اور چرخہ کی گونج کے ذریعہ اپنے حُسن کی خبر پہاڑ کے جوگی تک بھیج سکتی ہے۔ کون جانے یہ جوگی کس پہاڑ پر رہتا تھا؛ چرخہ کی گونج اُس کے کان میں پہنچی تو اُس نے سمجھا کہ کاتنے والی ضرور کوئی حسینہ ہے۔ اِسی جذبہ کے زیرِ اثر وہ نیچے اُتر آیا اور اپنے خیال کا سچ جھوٹ دیکھنے کی غرض سے چرخہ کاتنے والی لڑکی کے پاس آپہنچا۔ تو اس سے کیا جوگی کی تپسیا بھنگ ہو گئی؛

جوگی چرخہ کاتنے والی عورت کے پاس آ گیا تو کیا ہُوا! گاؤں کی بہو بیٹی بدستور چرخہ کاتتی رہی ہوگی، دل ہی دل میں وہ خوشی خوشی اپنی کارستانی کا خیال کر رہی ہوگی۔ کون تھا یہ جوگی، دل پوچھتا ہے۔ کہیں یہ بات تو نہ تھی کہ ہماری کہانی کا شہزادہ سات سمندر پار کی شہزادی کی تلاش میں مایوس ہو کر جوگی بن گیا تھا' اور پھر ایک دن چرخہ کی گونج سُن کر دیہاتی شہزادی کے پاس آ پہنچا تھا! کسی ایسے ہی موقع پر بھرتری ہری گا اُٹھا تھا "عورت کے دل کو جکڑنا اُتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ آئینہ میں عکس کو باندھنا۔ عورت کے راستے دشوار گزار ہوتے ہیں، اونچے پہاڑوں کی پگڈنڈیوں کی طرح۔ اُس کے جذبات اوس کے قطروں کے ہم پلہ ہیں' جو صبح کے وقت پھول پتوں پر لٹکتے نظر آتے ہیں، اور عورت کی غلط فہمیاں اُس کے ساتھ اُسی طرح چمٹی رہتی ہیں جیسے انگور کی بیل پر زہریلی بوٹی!" جوگی کے خون میں ایک طوفان سا لہریں مارنے لگتا ہے۔ وہ کہہ اُٹھتا ہے، عورت سچ مچ "مایا" ہے۔

"ہر چرخے دے گیڑے، مِتراں نوں یاد کراں!"— 'چرخہ کے ہر چکر کے ساتھ میں اپنے دوست کو یاد کیا کرتی ہوں'— جوگی دور سے عورت کا گیت سُنتا ہے اور سوچتا ہے' عجب دل لگی ہے کہ عشق کے نغمے گانے والی دوشیزہ میری طرف دیکھتی تک نہیں، تو پھر وہ کس دوست کو یاد کر رہی ہے؛

جوگی اپنی راہ لیتا ہے۔ عورت کے گیت جاری رہتے ہیں۔

"جند تیرے حوالے کیتی، جند دیاں وٹ پونیاں!"

—' اپنی زندگی میں نے تیرے حوالے کر دی ہے' میری اس زندگی (کو روئی سمجھ لے اور کاتنے کے لئے اِس) کے گالے بنا لے!'— عورت کا ایثار ہی سچ مچ اُس کی محبت کی جان ہے۔

"تند تیریاں غماں دی پاواں، چرخہ میں آپنا کتاں!"

'میں تیرے غموں کے تار نکالتی ہوں، حالانکہ سُوت میں اپنے چرخہ پر کات رہی ہوں'— وہ اپنے محبوب کا غم نہیں برداشت کر

سکتی۔ وہ چرخہ کاتتی جاتی ہے اور اُس کے ہجر میں آنسو بہاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وُہ اپنے دل کے چرخہ پر غم و ہجر کی رُوئی کات رہی ہے۔

پہاڑ کے قدموں سے ٹکرا کر اپنا بہاؤ بدلتی ندی کی طرح چھلّو گاتے گاتے اپنے نغموں کا رُخ بدلتی رہتی ہے۔ ٹھنگنی لڑکی کا گیت دن میں چار پانچ بار تو ضرور ہی گا لیتی ہوگی۔

"مدھری رَن دا کی صلاحنا، جیوں چرخے دا مُنّا
تُردی پھردی نظر نہ آوے، بیڑھا سُنّم سُنّا"

—"ٹھنگنی عورت کی کیا تعریف کی جائے؛ چرخہ کے پائے سی ہی تو ہے وہ!
چلتی پھرتی وہ نظر نہیں آتی، آنگن سُونا معلوم ہوتا ہے"۔

کسان اور اُس کی بیوی صدیوں سے خوابوں سے بوجھل گیت گاتے آرہے ہیں۔ ہر وہ شخص جو ہل اور چرخہ کی شاعری سُننا چاہتا ہے۔ جو پُرانے تمدّن کے اچھوتے بول سُننا چاہتا ہے، ایک بار ہمارے گاؤں میں آجائے۔ صدیوں سے کسان عورت کی آواز گونجتی چلی آرہی ہے:-

"میرا لے چل چرخہ اُتھے، وے جتھے تیرے ہل وگدے!"

—"میرا چرخہ وہاں لے چل جہاں تیرا ہل چل رہا ہے!"

آج بھی کسان عورت کے پاس ٹھوس حقیقت کو الفاظ میں منتقل کر دینے والی یہ قوت موجود ہے۔ صرف تفریح میں پریم کا رنگ نکھرتا ہو، یہ بات نہیں۔ خاوند ہل چلاتا رہے اور کھیت کے کنارے جھونپڑی کے دروازے پر بیوی چرخہ کاتا کرے، اور اس طرح اُس کی آنکھیں محبوب کو بیج کے لئے کھیت تیار کرتے دیکھا کریں —— زندگی کی یہ تصویر ایک نئی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ بھلے ہی گرم ہوائیں چلیں، سُورج آگ برسائے، کسان کی خوش نصیبی میں کیسے شک ہو سکتا ہے جبکہ اُس کا بہترین سرمایہ —— بیوی کا مکھڑا —— چار قدم پر موجود ہے۔

چرخہ اور ہل دیہاتی زندگی کے دو زبردست پہیئے ہیں۔ "جب آدم ہل چلایا کرتا تھا اور حوّا چرخہ کاتتی تھی، تب آج کا "جنٹلمین" کہاں تھا؟"[1] پُرانے انگریزی گیت میں چرخہ اور ہل کی اہمیت تہذیب کے بُنیادی معیار پر روشنی ڈال رہی ہے۔

حوّا کی بیٹی آج بھی چرخہ کاتتی ہے۔ اور چرخہ کے گیت، جنہیں گاتے چھلّو کبھی تھکتی نہیں، ایک ایسا بے نظیر مقامی رنگ لئے ہوئے ہیں جو وطنیت کے پیچھے چلنے والی دلچسپ شاعری کی جان ہُوا کرتا ہے۔

خاص کر وہ چرخہ جو ماں سے ملا ہو، جُوں جُوں پُرانا ہوتا جاتا ہے اُس کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔ یقین نہ ہو تو سُسرال میں چرخہ کاتتی دُلہن کا گیت سُن لیجئے چھلّو کی زبانی:-

---

[1] "When Adam delved and Eve span
Where was then a gentleman?"

"ماں میری نے چرخہ دتّا، وِچ سیو نے دیاں میخاں!
نی مائے! تینوں یاد کراں، جد چرخے دل ویکھاں!!"

—'میری ماں نے مجھے یہ چرخہ دیا تھا، اِس میں سونے کی میخیں لگی ہوئی ہیں۔ اماں! مَیں تجھے یاد کیا کرتی ہوں، جب بھی مجھے یہ چرخہ نظر آجاتا ہے!'

جب چھلّو کی شادی ہوجائے گی تو وہ شاید اس گیت کو اپنی سوانحِ عمری کا ایک ورق بنالے گی۔ یہ ہے مادری محبت کی یاد، جس کے زیرِ اثر چرخہ میں لگی ہوئی پیتل کی میخیں سونے کی معلوم ہوتی ہیں۔

غریبوں کے چرخے کیکر کی لکڑی سے تیار ہوتے ہیں جس کا باپ یا خاوند امیر ہو وہ شیشم کا چرخہ پاکر پھولی نہیں سماتی۔ چرخہ خوبصورت نہ ہو تو کاتنے کا مزا کرکرا ہوجاتا ہے۔

"چرخہ میرا رانگلا، تند کڈھاں دریاؤ!"—'میرا چرخہ رنگین ہے اور میں دریا (جتنا لمبا) تار نکالتی ہوں!'— خوش قسمت دُلھن کا یہ گیت گاتے گاتے ترنجن کی سہیلیاں فخر سے اپنا سر اونچا کرلیتی ہیں۔ دیہات کی جدت پسند شاعری کھیتوں اور ترنجنوں میں پلی ہے، اس نے دریاؤں کی روانی دیکھی ہے۔

(۲)

چھلّو چرخہ کات رہی ہے۔ اُس کے چرخہ کی رفتار کبھی سست نہیں پڑتی۔ روز بروز، لمحہ بہ لمحہ اُس میں سمجھ بوجھ پیدا ہوتی گئی ہے مگر آج بھی اُسے بچپن کے وہ دن بھولے نہیں جب وہ اپنی ماں کے چرخہ کے سامنے بیٹھ کر ماں کی طرح باریک تار نکالنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ ماں کہتی "نا چھلّو، ابھی تو بچّی ہے۔ ضِد مت کر بیٹی" "اُٹھ کھڑی ہو یہاں سے۔ دیکھنا تکلا مت خراب کردینا"۔ چھلّو نہ مانتی، ماں گھورتی، اور پھر چھلّو رونے لگتی۔ مَیں نے خود اُسے روتے دیکھا تھا، اُس کے اصرار پر اُس کی ماں کہہ رہی تھی" میں تجھے ایک چرخی منگوا دوں گی"، "میں رنگین چرخی لُونگی" چھلّو کہہ رہی تھی "اچھا رنگین ہی سہی"— ماں کے مُنہ سے یہ الفاظ کہلوا کر کہیں چھلّو چُپ ہوئی تھی۔ آج وہ بچپن کے دن بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

چھلّو کا گھر دُور نہیں۔ ہماری اِس گلی میں وہ سامنے کا گھر، جہاں چھلّو پیدا ہوئی، جہاں اُس نے چرخہ کاتنا سیکھا، جہاں چرخہ کے گیت اُس کی زبان پر چڑھے اُس کی شادی کے بعد بالکل اُداس ہوجائے گا، اور وہ وقت اب بہت دُور نہیں۔ ترنجن تو اُس کی غیرحاضری میں بھی لگا کریں گے، مگر چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر چھلّو کی ماں ہمیشہ اپنی بیٹی کی جُدائی محسوس کیا کرے گی۔

چرخہ کاتتی چھلّو کا آنچل اُس کے کندھوں سے سرک کر ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ وہ ترنجن کی رانی ہے۔ ترنجن تو میں نے اپنے ہی گاؤں میں سینکڑوں دیکھے ہیں مگر جو ترنجن چھلّو کے آنگن میں جمع ہوتا ہے، اُس کی رنگینی اور رونق کا کیا مقابلہ! اس ترنجن کی خاص خوبی یہی ہے کہ یہاں کبھی گہرے کُہرے کی طرح خاموشی نہیں چھائی رہتی۔ حق تو یہ ہے کہ چھلّو سے بڑھ کر گانے والی لڑکی ہمارے گاؤں میں آسانی

سے نہ مل سکے گی۔

"جب بیٹا پیدا ہوتا ہے، گھر کی دیواریں کانپ اُٹھتی ہیں، کہتی ہیں، نیا برخوردار آرہا ہے، کون جانے وہ ہماری خوبصورتی میں اضافہ کرے گا یا ہمیں اُکھاڑ پھینکے گا!" ۔۔۔ پنجاب کے کسان یہ بات بڑے شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ لڑکی کی پیدائش سے متعلق ایسی کوئی بات میرے سننے میں نہیں آئی۔ لڑکی سے والدین کے گھر کی دیواریں بھلا کیوں ڈریں گی! ایک دن وہ اِس گھر کو خیرباد کہہ کر سسرال کی راہ لے گی۔

ایک ایک کر کے تنجن میں جمع ہونے والی سب کی سب کنواری لڑکیاں بیاہی جائیں گی۔ اُن کی جگہ دُلہنوں کو ملتی جائے گی۔ چھلّو کا کوئی بھائی ہوتا تو اُس کی ماں اسی اُمید پر خوشی منا سکتی تھی کہ ایک دن چھلّو کی غیر حاضری سے پیدا ہونے والی اُداسی اُس کے بیٹے کی بہو آنے پر رفع ہو جائے گی۔ بچپن کی سہیلیاں، جو ایک ساتھ تنجن میں جمع ہوتی رہیں، بیاہ کے بعد بھی میکے آتی رہیں گی، لیکن سب کی سب تو پھر اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔

"پُور بیڑی دا، تنجن دیاں کُڑیاں، سبب نال ہون کٹھیاں!"

۔۔۔ کشتی میں ایک ساتھ پار ہونے والے مسافر اور تنجن میں ایک ساتھ چرخہ کاتنے والی لڑکیاں، بڑی مشکل سے اکٹھی ہوتی ہیں!

چھلّو اُس دُلہن کا گیت دُہرایا کرتی ہے جس نے سسرال کے راستہ میں کہا تھا "لگیاں تنجن دیاں، مینوں یاد گڈی وچ آئیاں"!

۔۔۔ تنجن میں مَیں نے جن سے پیار کیا تھا وہ لڑکیاں مجھے اب اِس بیل گاڑی میں بیٹھے یاد آرہی ہیں! اور اُسے کسان دُلہن کا وہ انگنج گیت بھی یاد ہے جس میں اُس نے ایک بار میکے میں لوٹ کر گھر کے پچھواڑے میں کھڑے بڑ کے درخت سے پوچھا تھا کہ اُس کی چھاؤں میں جمع ہونے والے تنجن کہاں چلے گئے!

بوڑھے بڑ نے، جس نے اپنے نیچے ہزاروں تنجن دیکھے تھے، جواب دیا تھا۔

"کجھ سوہرے کجھ پیو کرڑے، کجھ ملتے راہ پئے!

بھریاں مُراحیاں رہ گئیاں، پیالے کول پئے!!"

۔۔۔ کچھ لڑکیاں سسرال چلی گئی ہیں، کچھ ابھی یہاں اپنے میکے ہی میں ہیں، اور کچھ (موت کے) لمبے راستے پر چلی گئی ہیں!

بھری ہوئی صُراحیاں رہ گئیں، ہائے! پیالے بھی اُن کے پاس پڑے رہ گئے!

زندگی اور موت کے دوراہے پر پیدا ہونے والے گیتوں میں خود بخود صُوفیانہ رنگ آجاتا ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ تنجن کی ہر لڑکی "موت کے لمبے راستہ" پر گامزن ہوتے وقت ٹیگور کے الفاظ میں یہ کہہ سکے "اے میری دُنیا! اجنبی کی طرح میں تیرے کنارے پر آئی، مہمان کی طرح تیرے گھر میں رہی، اور اب میں تجھے ایک سہیلی کی طرح چھوڑ رہی ہوں"۔

(۳)

کئی سال کی خانہ بدوشی کے بعد حال ہی میں جب مَیں اپنے گاؤں پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ چھلّو اب وہاں نہیں ہے۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی ہے۔

اور یہ جان کر میں بہت حیران ہُوا کہ ہماری گلی کی سب کی سب عورتیں چھلّو کی غیر حاضری میں بھی بدستور خوشی خوشی تنجن میں جمع ہُوا کرتی ہیں، اور تو اور، چھلّو کی ماں بھی اُتنی اُداس نہیں جتنی میرے اندازہ کے مطابق وہ ہونی چاہئے تھی۔

گھر کے کھُلے آنگن میں چرخہ کاتنے والیوں کی بزمِ سخن روز بروز ہمارا من موہنے کے لئے جمی رہتی ہے۔ بیسیوں لڑکیاں بیاہ کے بعد اس تنجن سے الگ ہوجاتی ہیں، بیسیوں دُلہنیں اُن کی جگہ خانہ پُری کے لئے آحاضر ہوتی ہیں۔ تنجن قائم رہتا ہے اور گھر کا آنگن سمندر کے ساحل کی طرح ہوتا ہے جہاں چمکتی ریت صدقِ دل سے نئی نئی لہروں کے انتظار میں پڑی رہتی ہے۔ چرخہ کاتنے والی ہر بہو بیٹی ایک ایک لہر ہی تو ہوتی ہے۔

چھلّو وہاں اپنی سُسرال میں کیا سوچ رہی ہوگی؛

اس پہاڑ کی وہ کُونج اُس پردیس میں کیا کبھی بچپن کی سہیلیوں کو یاد نہ کرتی ہوگی؛ کبھی وہ اپنی ماں کے آنگن میں کوئل کی طرح کُوک کُوک کر گایا کرتی تھی "کُونجے پہاڑ دیئے، کدے پا وطناں وَل پھیرا ائے" او پہاڑ کی کونج! کبھی تو اپنے وطن کی طرف بھی آ — ہائے! آج وہ خود کُونج بن کر اپنے میکے سے اُڑ گئی!

ہاں، تو چھلّو کی غیر حاضری میں بھی چرخوں کی گھُوں گھُوں قائم ہے! رات کے وقت چاند بدستور ہمارے گاؤں کے مکانوں پر اپنا آشیرواد بھیجتا ہے۔ ستارے بھی ہمارے گھروں کی طرف پہلی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ قدرت کے نظام میں گاؤں کی کسی ایک لڑکی کے آنے جانے سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ مگر ہائے! چھلّو چلی گئی اور میرا دل اُداس ہے۔ چاند کیوں اُداس نہیں؛ ستارے میری اُداسی میں کیوں شریک نہیں ہوتے؛ ٹھیک، چاند اور تارے تو اُسے اُس کی سُسرال میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

چھلّو کے آنگن میں اُس سے کچھ گیت سُن کر لکھنے کے بعد میں نے جو الفاظ کہے تھے وہ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ بسنت پنچمی کا دن تھا، سرسوں کے کھیت کی سی طراوت اُس کے بشاش چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔ "چھلّو اب سیانی ہو رہی ہے!" میں نے کہا تھا، اور سرسوں کا پھُول، جسے میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، کہہ رہا تھا "سیانی ہی نہیں ہو رہی، چھلّو نکھر بھی رہی ہے!" چھلّو کی ماں مسکرا رہی تھی، اور خود بہن چھلّو بھی، جس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی۔

میں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ چھلّو کی یاد میں میں اتنا اُداس ہو جاؤں گا۔ آج وہ مجھے نظر آ جائے تو میں شاعر کے الفاظ میں اُس سے کہہ دوں "تو مسکرا دی، اور تو نے میرے ساتھ کوئی بات چیت نہ کی، اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے ایک مدّت سے تیری مسکراہٹ کا انتظار تھا!"[1]

اپنی سُسرال میں بھی وہ تنجن کی رانی ثابت ہوئی ہوگی۔ شاعری کے وہ سب جواہر پارے، جو اَن گنت نسلوں کے بعد سینہ بہ سینہ اُس تک آ پہنچے ہیں، بدستور اُس کی زبان پر ہوں گے، اور مجھے یقین ہے کہ اُس کا خاوند اُس کے لئے ایسا ہی ثابت ہُوا ہوگا جیسا ہماری کہانی کا وہ شہزادہ جو سات سمندر پار کے نامعلوم جزیرہ کی شہزادی سے شادی کرنے کی دُھن میں دیوانہ ہو گیا تھا۔

دیوِندر ستیارتھی

لاہور۔ ماڈل ٹاؤن
۲۷ نومبر ۱۹۴۰ء

[1] ٹیگور

مہمانداری

پھیلی ہے فضاؤں میں خوشی میری نظر کی
ہنستی نظر آتی ہیں فضائیں مرے گھر کی

دلشاد مرے اہل و عیال آج بہت ہیں
مصروف ہیں وہ بھی نہیں مصروف فقط ہیں

رکھی ہے سلیقہ سے ہر اک کام کی چیز آج
مہمان مرے گھر میں ہیں کچھ میرے عزیز آج

شادی کا مکاں گھر مرا معلوم نہ ہو کیوں
مجمع ہو جب اتنا تو بھلا دھوم نہ ہو کیوں

بھائی بھی ہیں بہنوئی بھی بھاوج بھی بہن بھی
بیٹھا ہے بھتیجا بھی بھتیجے کی دلھن بھی

بچی اک ادھر بیٹھ کے تکتی ہے دلھن کو
کچھ طفل ستاتے ہیں ادھر اپنی بہن کو

بچوں پہ جھلک خاص ہے تنویر سحر کی
اُٹھ بیٹھے ہیں سب سنتے ہی آواز گجر کی

دلکش یہ فضا صبح کی یہ نور کا تڑکا
بلبل کی طرح بول رہا ہے کوئی لڑکا

بے وجہ کوئی رونے پہ آمادہ ہوا ہے
حیرت سے "نئے گھر" کو کوئی دیکھ رہا ہے

بیٹھا ہے یہ چپ دوڑ رہا ہے وہ خوشی سے
کھانے کے لئے ضد کوئی کرتا ہے ابھی سے

کرنا ہے جو سامانِ ضیافت کا فراہم
آ آکے مرے کان میں کچھ کہتی ہیں بیگم

ہونا ہے جو خوبی سے ضیافت کا سرانجام
لڑکی کے ذریعہ سے بھی پہنچاتی ہیں پیغام

آتی بھی ہیں جاتی بھی ہیں بیگم سوئے مطبخ
ماماؤں میں بے وقت جہاں ہوتی ہے چخ چخ

راحت نہ ملے کیوں انہیں ہلکی تگ و دو میں
سایہ کی طرح ساتھ ہے لڑکی بھی جلو میں

ننھی ابھی اٹھی نہیں پہلو سے پھوپھی کے
لیتی ہیں وہ رہ رہ کے مزے اس کی ہنسی کے

لڑکے مرے خوش ہو کے ادھر دیکھ رہے ہیں
اخلاص و محبت سے مخاطب ہوں جدھر میں

مجمع یہ عزیزوں کا محبت کی یہ باتیں
ان پیار کی باتوں میں نہ چوٹیں ہیں نہ گھاتیں

انوار تبسم کے تکلم سے ہیں پیدا
ضوِ صبح کی اس منظرِ دلکش پہ ہے شیدا

باتوں کا ابھی تھا طربی سلسلہ جاری
نرگس نے کہا آکے، ہے تیار نہاری

علی منظور

غزل

اُس وقت مجھے فرقت کر دیتی ہے دیوانہ
جب شمع پہ گرتا ہے پروانہ پہ پروانہ

دیکھا ہے کبھی تُو نے اَے زاہدِ بیگانہ؛
جھینپی ہوئی نظروں میں بہتا ہؤا مےخانہ

چھا، یوں نہ نگاہوں پر اَے جلوۂ جانانہ
بن جاؤں نہ سودائی ہو جاؤں نہ دیوانہ

آ جائے اگر ضد پر ساقی ترا مستانہ
بوتل سے لڑے بوتل، پیمانہ سے پیمانہ

رودادِ محبت ہے دیباچۂ حیرت پر
اب ختم جہاں جا کر ہو جائے یہ افسانہ

منجملۂ وحشت اِک یہ بھی ہے جنوں مجھ کو
ہر ایک سے کہتا ہوں کس کا ہوں میں دیوانہ؛

تاریخِ محبت کی تخلیق، ارے توبہ!
ہوتی رہیں سرآہیں، بنتی رہیں افسانہ

دو چار مقام اَیسے آتے ہیں محبت میں
کچھ سوچ کے خود انساں بن جاتا ہے دیوانہ

وُہ اُن کی پشیمانی، وہ میرا دمِ آخر
بڑھتی رہیں تاثیریں، گھٹتا رہا افسانہ

اقلیمِ محبت میں آغازِ محبت سے
ہے موت کی وادی تک ویرانہ ہی ویرانہ

حالات بدلتے ہیں صرف اُن کے اشاروں پر
وُہ کہہ گئے دیوانہ، میں ہو گیا دیوانہ

تم نزع کے عالم میں بالیں سے سرک جاؤ
بدلے گا یہاں سے اب پہلو مرا افسانہ

سمجھاتا ہوں یوں دِل کو اَے ابر جُدائی میں
جس طرح مخاطب ہو دیوانہ سے دیوانہ

ابر احسنی گنّوری

خدا حافظ

بعض اشخاص میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ اگر وہ کسی دوست یا عزیز کے ہاں ملنے چلے جائیں تو پھر وہاں سے واپس آنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ بڑی کوشش کے ساتھ اپنے آپ کو 'خدا حافظ' کہنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں لیکن یہ الفاظ سعیِ بسیار کے باوجود جنبشِ لب سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بادلِ ناخواستہ انہیں وہیں بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے اشخاص کو باتیں کرتے کرتے کافی دیر ہو جاتی ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ اب ہمیں واپس اپنے گھر چلنا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ یکایک اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں "میرا خیال ہے کہ مجھے اب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" لیکن ان کے دوست بات کاٹ کر کہہ اُٹھتے ہیں "آپ واپس جانا چاہتے ہیں؟ اجی صاحب رہنے بھی دیجئے۔ ابھی تو زیادہ وقت نہیں گزرا۔"

میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں میرے دوست میلو مینس جونز کی داستان سب سے زیادہ قابلِ رحم اور افسوسناک ہے۔ جونز ایک نہایت شریف اور سیدھا سادھا نوجوان تھا۔ اس کی عمر صرف ۲۲ برس تھی۔ جونز میں سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ کسی مجلس میں بیٹھ گیا تو پھر وہاں سے اُٹھنا ناممکن تھا۔ بے چارہ بہت کوشش کرتا کہ رخصت کی اجازت لے کر چلا جاؤں لیکن شرم اس کی زبان پکڑ لیتی۔ وہ بے حد شرمیلا تھا۔ میں نے اس سے زیادہ حیادار نوجوان آج تک نہیں دیکھا۔ وہ اتنا نیک نفس اور خوش اخلاق تھا کہ نہ جھوٹ بول سکتا تھا، نہ بدتمیزی کا مظاہرہ کر سکتا تھا اور ظاہر ہے کہ ان کے بغیر دوستوں کی مجلس سے اُٹھ کر چلے آنا بہت مشکل ہے۔ جونز غریب کو جھوٹے بہانے بنانے نہیں آتے تھے اور بدتمیزی سے تو وہ بے حد نفرت کرتا تھا۔

کالج میں جس دن گرمی کی تعطیلات ہوئیں جونز اسی دن سہ پہر کو اپنے ایک دوست کے ہاں جا پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر واپس چلا آؤں گا۔ اور اگر کچھ دیر زیادہ بیٹھنا بھی پڑا تو کیا حرج ہے؟ چھ ہفتے کی چھٹیاں ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔ چھ ہفتے اور کرنا ہی کیا ہے؟

اس کا دوست بڑے تپاک سے ملا۔ جونز نے چائے کی دو پیالیاں پیں۔ تھوڑی دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ پھر وہ ہمت کر کے اُٹھا اور کہنے لگا "میرا خیال ہے کہ مجھے ۔ ۔ ۔ ۔" لیکن اس کے دوست کی والدہ نے اسے فقرہ مکمل نہ کرنے دیا اور بات کاٹ کر بولیں "مسٹر جونز کیا تم کچھ دیر اور نہیں ٹھہر سکتے؟"

اب ذرا جونز کی قابلِ رحم حالت کا اندازہ لگائیے۔ وہ زیادہ دیر ٹھہرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ کالج چھ ہفتے کے لئے بالکل بند ہو چکا تھا اور جونز کو کوئی کام نہیں تھا۔ اس لئے وہ جھوٹ موٹ اپنے دوست کی ماں سے کیسے کہہ دیتا کہ میں اب زیادہ دیر

یہاں نہیں ٹھہر سکتا؛ وہ تو ہمیشہ سچ بولنے کا عادی تھا۔ کہنے لگا "جی ہاں۔ ٹھہر تو سکتا ہوں۔ کچھ اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر بیٹھئے نا!"

وہ بے چارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ چائے کا دَور جاری تھا۔ وہ گیارہ پیالیاں ختم کر چکا تو اس نے محسوس کیا کہ مجھے اب واپس جانا چاہئے۔ وہ اُٹھا اور شرما کر کہنے لگا "اچھا تو۔۔۔ اب مجھے اجازت۔۔۔۔۔" اس کے دوست کی مہربان ماں دوبارہ اس کی بات کاٹ کر بولی "تو تمہارا واپس جانا کیا بے حد ضروری ہے؛ میرا خیال تھا کہ تم ڈنر تک یہیں ٹھہر سکتے ہو۔"

"ٹھہرنے کو تو میں ٹھہر سکتا ہوں مگر۔۔۔۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر مت جائیے۔ جوزف کے ابا آپ سے مِل کر بہت خوش ہوں گے۔" جونز کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس کا پیٹ چائے سے بھرا ہوا تھا اور اس کے چہرے سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔ لیکن اب وہ کر ہی کیا سکتا تھا؛ ناچار اپنی جگہ جا بیٹھا۔

جوزف کے ابا بھی تشریف لے آئے۔ سب نے مِل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں جونز یہی منصوبے باندھتا رہا کہ ساڑھے آٹھ بجے واپس چلا جاؤں گا۔ اس کی خاموشی کی وجہ سے اس کے میزبان اسے احمق سمجھ رہے تھے۔

ڈنر کے بعد جوزف کی اماں نے مہرِ سکوت توڑنے کی کوشش کی، اور تصویروں کا البم نکال کر جونز کو اپنے عزیزوں اور دوستوں کے فوٹو دکھانے شروع کر دیئے۔ دس بیس تصویریں ہوتیں تو جونز کی خلاصی جلدی ہو جاتی لیکن وہاں تو پورا عجائب گھر تھا۔ ابا کے چچا کی تصویر، ابا کے نانا کی تصویر، اماں کی دادی کی خالہ کے بیٹے کی پوتی کے شوہر کی تصویر، ابا کی چچی کے بہنوئی کے ماموں کے بیٹے کے سالے کی بیوی کی تصویر۔ اور ان سب سے زیادہ دلچسپ ابا کے چچا کے ایک دوست کی تصویر تھی جو اپنی بنگالی وردی میں ملبوس تھے۔ ایک تصویر ابا کے دادا کے ایک دوست کے کتے کی تھی۔ ایک تصویر خود ابا کی تھی۔ جب انہوں نے "فینسی ڈریس ناچ" کے لئے شیطان کا بہروپ بھرا تھا۔ گھڑی نے ساڑھے آٹھ بجائے تو جونز کو اپنا ارادہ یاد آیا۔ مگر ابھی تو اس نے صرف اکہتر تصویریں دیکھی تھیں اور اُنہتر باقی تھیں۔ بہرحال اس نے جرأت سے کام لیا اور کہنے لگا "معاف کیجئے گا اب میں شب بخیر کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"شب بخیر کہنے کی اجازت؛ ابھی تو ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ کیا تمہیں واپس جا کر کوئی ضروری کام کرنا ہے؟"

سچی بات یہ تھی کہ جونز کو واپس جا کر کوئی ضروری کام نہیں کرنا تھا لیکن اگر وہ بہانہ بنا لیتا اور کہہ دیتا کہ ہاں مجھے ایک ضروری کام ہے تو ضرور اسے اجازت مِل جاتی، مگر وہ اتنا شریف نوجوان تھا کہ کسی صُورت میں بھی جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "ضروری کام تو کوئی نہیں۔"

"تو پھر تم اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو؟"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ معلوم ہُوا ننھے جان نے مسٹر جونز کی ٹوپی کہیں چھپا دی ہے۔ اِس وقت تک تو صرف جوزف کی اماں ہی جونز پر کچھ دیر اَور ٹھہرنے کے لئے زور دے رہی تھیں، اب اس کے ابا بھی کہنے لگے "میاں صاحبزادے! اب تو تمہیں کچھ دیر اَور رُکنا ہی پڑے گا۔ جان نے خوب کیا کہ تمہاری ٹوپی چھپا دی، آؤ ہمارے پاس بیٹھو، پائپ پیو اور گپیں ہانکو۔ زندگی میں اَور دھرا ہی کیا ہے؟" مجبوراً جونز کو جوزف کے ابا کی دعوت قبول کرنی پڑی۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ اب اُٹھ کر چلا جائے مگر کوئی نامعلوم طاقت اس کے پاؤں پکڑ لیتی۔ جوزف کے ابا اُس کی اس خاموشی سے اُکتا گئے، وہ اُن سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔

آخر اُنہوں نے تنگ آ کر کہا "میاں جوزر، تم نے تو ایسی چُپ سادھ رکھی ہے کہ گویا بات کرنا قسم ہے۔ اب تو یہی بہتر ہے کہ تم رات یہیں بسر کرو۔ صبح تک تمہیں بات کرنا تو سکھا دیں گے"۔ اُنہوں نے تو یہ سب کچھ طنز کے طور پر کہا تھا لیکن بھولا بھالا جوزر ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور آنکھوں میں شکریہ کے آنسو بھر کر بولا "بہت اچھا اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں"۔ جوزف کے ابا نے اسے ایک خالی کمرے میں سُلا دیا اور دل ہی دل میں اس کی سادہ لوحی پر اُسے خوب گالیاں دیں۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد جوزف کے ابا اپنے دفتر چلے گئے۔ شکستہ دل جوزر اس وقت ننھے جان کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھا۔ اس کے اعصاب اسے جواب دے چکے تھے۔ دن میں کئی بار اس نے اپنے گھر واپس جانے کی کوشش کی لیکن اسے ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اپنے دوست خصوصاً اس کی والدہ سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کرے۔ جب جوزف کے ابا شام کو گھر لوٹے تو جوزر کو وہاں دیکھ کر انہیں تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ انہوں نے سوچا اس بیوقوف کو چھیڑنا چاہئے ورنہ یہ یہاں سے نہیں نکلے گا۔ وہ کہنے لگے "مسٹر جوزر! میرا خیال ہے کہ تمہیں یہاں رہنے کے لئے اپنے قیام و طعام کے مصارف ادا کرنے پڑیں گے۔ ہا ہا ہا کیوں میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟ آ ہا ہا ہا"۔ بے چارہ جوزر یہ سُن کر حیران اور ششدر کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اس نے جیب سے بٹوا نکالا اور ایک مہینہ کا خرچ پیشگی جوزف کے ابا کے حوالے کر دیا۔

اب وہ غمگین رہنے لگا۔ سارا دن چُپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی صدمہ اندر ہی اندر اُسے کھائے جا رہا ہے۔ تازہ ہوا اور ورزش کے فقدان کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی صحت بگڑنے لگی۔ وہ سارا دن چائے پینے اور اپنے دوست کے خاندانی البم کی تصویریں دیکھنے میں گزار دیتا۔ وہ گھنٹوں جوزف کے ابا کی خالہ کے نانا کی بھتیجی کے شوہر کے دوست کے شکاری کتے کی تصویر کو دیکھتا رہتا۔ جوزف کے ابا کے چچا کے دوست کی وہ تصویر جو اُنہوں نے اپنی بنگالی وردی میں کھنچوائی تھی اسے بہت پسند تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کبھی وہ اس تصویر کی تعریف کرتا تھا اور کبھی جوزف کے ابا کے چچا کے دوست کو گالیاں دینا شروع کر دیتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دماغی توازن بگڑ رہا ہے۔

آخر وہ وقت آ پہنچا جس کا مدت سے خطرہ لگا ہوا تھا۔ جوزر شدید بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی بیماری انتہائی خطرناک تھی اور وہ ہر وقت ہذیان بکتا رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے تمام قویٰ اسے جواب دے رہے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود کسی کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ جوزف کے ابا کے چچا کے بنگالی وردی میں ملبوس دوست کو بھی نہ پہچان سکا۔ کبھی کبھی وہ بے اختیار بستر سے اُٹھ کھڑا ہوتا اور کہتا "میرا خیال ہے کہ مجھے اب ...." پھر وہ ایک ہولناک قہقہہ لگاتا اور دوبارہ اپنے بستر پر جا لیٹتا۔ تھوڑی دیر آرام سے لیٹے رہنے کے بعد وہ دوبارہ اُٹھ بیٹھتا اور چیخ کر کہتا "چائے کی ایک اور پیالی لاؤ۔ باقی تصویریں کہاں ہیں؟ ہا ہا ہا!"

آخر کار ایک مہینہ مسلسل عذاب برداشت کرنے کے بعد وہ اپنی تعطیلات کے آخری دن چل بسا۔ سُنا ہے کہ جب اس کا وقت آ پہنچا تو وہ اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے نہایت اطمینان اور اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا "فرشتے مجھے بُلا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے واپس جانا چاہئے ـــ اچھا خدا حافظ!" (اُس کی رُوح اس تیزی کے ساتھ اس کے جسم میں سے پرواز کر گئی جس طرح کوئی بلی اپنے تعاقب میں آنے والے شکاری کتوں کے ڈر سے باغ کی دیوار پھاند جاتی ہے)

(لی کاک) ـــــــــ حمید نظامی

تأثّرات

وہ صُبح کا تارا ہے دھندلکوں میں خراماں
یا چاند کا۔ بدلی سے۔ ٹپکتا ہے اُجالا
یا میری صبوحی ہے کہ پنگھٹ کے کنارے
لہراتی ہے اوڑھے ہوئے نیندوں کا دوشالا

گزری ہوئی راتوں کے فسانے نہ سناؤ
خوابیدہ ہیں شعلے، انہیں تِنکے نہ دکھاؤ
مانا، کہ زمانے میں وفا مِل نہیں سکتی
لیکن مِرے دل پر تو یہ چرکے نہ لگاؤ

گرتی ہوئی بُوندیں ہیں کہ پارے کی لکیریں
بادل ہے کہ بستی پہ گجر دم کا دھُواں ہے
مغموم پپیہا ہے کہ بھٹکا ہُوا شاعر
جو پوچھتا پھرتا ہے "کہاں ہے، تو کہاں ہے؟"

شب بیت گئی اَور وہ اب تک نہیں آئے
کشتی مِری اُمید کی یوں ڈول رہی ہے
گویا کوئی آوارہ سی بھٹکی ہُوئی چڑیا
ڈالی پہ کسی نیم کی، پر تول رہی ہے

اے میری صبوحی تجھے اغیار کو سونپا
مَیں اب ترے اصرار پہ گھر لوٹ تو جاؤں
لیکن تجھے کاٹیں گے یہ ابریشمی پردے
ڈولی سے نکل آ، تجھے آنکھوں پہ بٹھاؤں

"دو بیگہ زمیں کاشت کی خاطر مجھے دے کر
تُم کرتے ہو چھُپ کر مری لڑکی کو اشارا
محنت تو بکا کرتی ہے غیرت نہیں بکتی"
افلاس کا مارا ہُوا دہقان پکارا

وُہ چاند گھٹاؤں کی نقاب اوڑھ رہا ہے
وہ پھیل گیا گاؤں کی گلیوں میں اندھیرا
چنگاری سی سوتے ہوئے دل میں بھڑک اٹھی
امید کی قبروں کو تری یاد نے گھیرا

کرنوں کی تمازت میں دمکتے ہوئے بُندے
جھونکوں کے تھپیڑوں میں لہکتا ہُوا آنچل
ہر گام پہ پازیب کا دھیما سا چھناکا
کیوں پھر سے ہری کرتی ہو اُمید کی کونپل

کل گاؤں سے کچھ دُور اِک افسردہ گڈریا
اِک پیڑ کی شاخوں کو کھڑا چُوم رہا تھا
مَیں بولا، "یہ کیا کھیل ہے؟" کہنے لگا ہنس کر
کچھ بوجھ سا تھا جی پہ یونہی گھوم رہا تھا

احمد ندیم قاسمی

نوائے درد

جب سے محبت کی کیفیت میری رُوح کو ہے تڑپائے
اِن آنکھوں میں ہے جو کچھ سب خواب کی صُورت آئے جائے
جان سے تن سے لبتی بَن سے درد بھری آواز سی آئے

ــــــــــــــ

کیف میں ڈوبا ہوتا ہوں جیسے کوئی نازک پھُول سُنگھائے
نیند سی آئے ہلکی ہلکی رُوح کو لوری دے کے سُلائے
جان سے تن سے لبتی بن سے درد بھری آواز سی آئے

ــــــــــــــ

ایک تحیّر سا گھیرے ہے رُوح پہ ہیں وہ جب سے چھائے
ہر آہٹ پر یہ دھوکا ہے آئے آئے اب وہ آئے
جان سے تن سے لبتی بن سے درد بھری آواز سی آئے

ــــــــــــــ

ٹھیس کبھی جب پیار کی ہلکی ٹھوکر سے دِل کو لگ جائے
دل کہتا ہے درد ہوں مَیں اور درد اپنے کو دل کہلائے
جان سے تن سے لبتی بن سے درد بھری آواز سی آئے

ــــــــــــــ

مقبول احمدپوری

زندگی اور مَوت

آنسہ نے ایک دم چائے کی پیالی ٹرے میں رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ ایک خبر کی سُرخی نے اُس کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی تھی۔ "مشہور افسانہ نگار کو حادثہ!" آنسہ نے بڑی تیزی سے اس سُرخی کے نیچے کی خبر پڑھی اور یہ خبر پڑھ کر بے اختیار اُس کا جی بھر آیا۔ لکھا تھا کہ کل شام کو ملک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر نجمی کو ایک سخت خوفناک حادثہ پیش آیا۔ وہ کناٹ سرکس سے سڑک کے کنارے کنارے جا رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا دوسری جانب سے ایک بچہ آیا کی اُنگلی چھڑا کر سڑک کے درمیان چلا آیا۔ سامنے سے ایک کار پُوری تیزی سے آ رہی تھی۔ ایک لمحہ کا معاملہ تھا۔ نجمی نے ایک لمحہ میں فیصلہ کیا۔ اور دوسرے لمحے کود کر وہ سڑک کے درمیان پہنچ چکے تھے۔ ابھی دوسرے لمحے میں کار بھی آ پہنچی۔ نجمی نے بچے کو ہاتھوں میں اُٹھا لیا تھا کہ کار سر پر آ گئی۔ بچہ بال بال بچ گیا لیکن نجمی کی حالت تشویشناک ہے۔ اُنہیں فوراً ارون ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔

آنسہ نے ایک مرتبہ اور اس خبر کو پڑھا۔ پھر اخبار ایک طرف رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے دل میں محبت اور ہمدردی کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔ وہ نجمی کے پاس جانا چاہتی تھی۔ وہ اُسے ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اُس سے دو ایک باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اُسے کچھ تسلی دینا چاہتی تھی۔ تسلی! ——— ہاں تسلی جو پہلے کبھی نہ دے سکی۔ اُس کی نگاہوں میں وہ حالات پھر رہے تھے جن سے مجبور ہو کر نجمی نے یہ اقدام ——— یہ خطرناک اقدام کیا تھا۔ ابھی دو دن ہوئے اُس نے نجمی کے ایک خط کا جواب دیا تھا اور یہ جواب بڑا مایوس کن تھا اور بڑا روح فرسا۔ نجمی کے دسیوں خط اُس کے پاس آئے تھے لیکن آنسہ نے کبھی اُسے یا اُس کے خطوں کو وقعت کی نظر سے نہ دیکھا تھا۔ خط آتے تو وہ اُنہیں معمولی توجہ سے پڑھ کر پھاڑ دیتی۔ کبھی کسی خط کے ملنے پر غصہ بھی آتا تو بھی زیادہ اثر نہ لیتی۔ آخری خط زیادہ التجائیں لئے ہوئے تھا اس لئے اُسے زیادہ غصہ آیا اور اس غصہ کو اُس نے خط کی صُورت میں ظاہر کیا۔ بہت سخت سُست الفاظ میں خط لکھنے پر اور محبت جتلانے پر لعنت ملامت کی۔ حادثہ کی خبر پڑھ کر اُسے ایک دم اپنے خط کا خیال آیا اور خط کا خیال آتے ہی اس بات کا خیال آیا کہ خط پڑھ کر نجمی کی نظروں میں دُنیا تاریک ہو گئی ہو گی اور اس نے اپنی زندگی ختم کر لینے کا تہیہ کر لیا ہو گا۔ لیکن خودکشی کے ارادے سے باز رہا۔ کل اُسے اتفاق سے ایک موقع ہاتھ آ گیا اور اُس نے جان بُوجھ کر اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی۔

آنسہ نے سوچ سوچ کر ہسپتال کو ٹیلیفون کیا۔ اتفاق سے دوسری جانب سے ایک ڈاکٹر نے جواب دیا۔ آنسہ نے پُوچھا "کل جو آپ کے یہاں ایک حادثہ کا مریض داخل ہُوا ہے اُس کا اب کیا حال ہے؟"

"آپ نجمی کے متعلق پوچھ رہی ہیں جو موٹر کے نیچے آ گئے۔"

"جی ہاں!"

"اُن کی حالت بہت خراب ہے۔ اُن کی زندگی کی کوئی اُمید نہیں"۔

ڈاکٹر کی بات سن کر اُسے اور زیادہ رنج پہنچا۔ گو اخبار میں بھی نجمی کی حالت تشویشناک لکھی تھی لیکن آنسہ کے دل میں خود بخود یہ اُمید پیدا ہو گئی تھی کہ اب نجمی کی حالت کچھ روبصحت ہو گی۔

ڈاکٹر نے جواب کا انتظار کر کے کہا "آپ کون ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی رشتہ دار ہیں کیا؟"

آنسہ نے کچھ سوچ کر کہا "جی ہاں"

"اگر آپ اُنہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہیں تو فوراً چلی آئیے۔ ہم اُنہیں انجکشن دے دیں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ دو ایک منٹ کے لئے ہوش میں آجائیں"

"میں ابھی چند منٹ میں پہنچ رہی ہوں"۔

آنسہ نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن پھر خیال آیا کہ معلوم نہیں وہ میرا خط ملنے کے بعد مجھ سے نفرت ہی کرنے لگے ہوں۔ ہوش میں آ کر اُن کے غم و غصّہ کے جذبات اُبھر آئیں اور مجھے بُرا بھلا کہنے لگیں۔ اور اس طرح آخری وقت میں خدا کی یاد سے غافل ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اُسے نجمی کی وہ کیفیت بھی یاد آگئی جو آنسہ کے سامنے اُس پر طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اُسے دیکھ کر ایک دم کھو سا جاتا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مُہر سی لگ جاتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے چاہنے والے پر ایسے نازک وقت میں کوئی اس قسم کی کیفیت طاری ہو۔ اور ان سب باتوں سے زیادہ اُسے اپنی طبیعت پر بھی اعتماد نہیں تھا۔ جس شخص کو مدتوں اُس نے کسی قابل نہیں سمجھا آج اُسی شخص کے لئے اُس کے دل میں محبت رحم اور عزت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔

ایک گھنٹہ اُس نے نہایت بے چینی سے گزارا۔ کمرے میں اِدھر اُدھر چکر کاٹتی رہی۔ کبھی جی میں آتا کہ فوراً ہسپتال چلی جائے اور کبھی سوچتی کہ نہ جانا ہی اچھا ہے۔ رہ رہ کر اپنے تغافل کا خیال آتا رہا۔ اس بات کا خیال آتا رہا کہ اگر وہ ذرا بھی اُس پر کرم کی نظر کر دیتی تو اُس کی زندگی کیسی خوشگوار بن جاتی اور اس طرح مایوس ہو کر وہ اپنی جان نہ دیتا۔ یہ اُسے خود بخود یقین آگیا تھا کہ نجمی نے دیدہ و دانستہ اپنی جان ہلاکت میں ڈالی ہے۔ اُسے نجمی کے خطوں کے فقرے یاد آنے لگے۔ ہاں اگر وہ مسکرا کر اُس سے صرف ایک بات کر لیتی تو وہ خوش ہو جاتا لیکن بات کرنا تو رہا ایک طرف اُس نے کبھی اُس کی جانب نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کبھی خیال آتا کہ انسان بھی کیسا متلون مزاج ہوتا ہے۔ آج تک جو میرے خیالات تھے وہ ایک واقعے نے بالکل بدل دیئے — ایک معمولی واقعے نے۔ دُنیا میں ہر روز ہزاروں حادثے ہوتے ہیں۔ اگر میں ہر ایک سے اتنی متاثر ہونے لگی تو جی چکی۔ لیکن یہ تو کوئی معمولی حادثہ نہیں — یہ اس کا حادثہ ہے جس کی دُنیا — جس کی سب کچھ میں ہی میں تھی۔ ایک بار اور ٹیلیفون اُٹھایا اور ہسپتال کا نمبر گھمایا۔ اُسی ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "ڈاکٹر صاحب نجمی کی حالت میں کچھ افاقہ ہوا"

"آپ کون ہیں" اُس نے جواب دینے کی بجائے اُلٹا آنسہ ہی سے سوال کر دیا۔

"میں اُن کی ایک رشتہ دار ہوں"۔

"آپ عجیب رشتہ ہیں کہ ٹیلیفون پر اُن کی حالت دریافت کرتی ہیں اور خود دیکھنے نہیں آتیں"۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر نجمی کی حالت سے بہت زیادہ متاثر ہے۔

آنسہ نے کہا" میں ضرور آتی لیکن مجھے افسوس ہے کہ وہ مجھ سے خوش نہیں تھے۔"

ڈاکٹر نے ایسے لہجے میں جواب دیا جیسے وہ مجبوری کو یہ بات کہہ رہا تھا" لیکن اب وہ کسی سے بھی ناخوش نہیں رہے۔"

آنسہ کے منہ سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی۔

ٹیلیفون پر ڈاکٹر کو آنسہ کی یہ آہ سنائی دے گئی۔ اُس نے ہمدردی کے طور پر کہا" صبر کیجئے محترمہ۔ خدا کی مرضی یہی تھی"۔

پھر اُسے ایک اور بات کا خیال آگیا۔ کہنے لگا" اور ہاں دیکھئے کل سے اُن کا کوئی وارث نہیں آیا۔ اُن کی میت کے لئے ——"

آنسہ نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ نجمی کے متعلق کچھ اور سُننا اُس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ڈاکٹر کیا کہنا چاہتا ہے۔ اُس نے نوکر کے ہاتھ ہسپتال میں روپے بھیج دیئے کہ نجمی کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر دیا جائے اور نوکر کو سختی سے تاکید کر دی کہ وہ اُس کا نام اور پتہ نہ بتائے۔

+

اس واقعے کے دو دن بعد ہسپتال میں شام کے وقت ایک نوجوان آیا اور آکر نجمی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جس ڈاکٹر نے اُس کا آپریشن کیا تھا اُس سے دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ مرحوم کی جیب سے ملاقاتی کارڈوں کا ایک بنڈل نکلا تھا جن پر نجمی جرنلسٹ لکھا ہُوا تھا۔ صرف ایک اس بات سے وہ سمجھے تھے کہ وہ نجمی ہے۔ ورنہ جب وہ ہسپتال میں داخل ہُوا تو بے ہوش تھا اور بیہوشی ہی کے عالم میں چل بسا۔ اور کوئی رشتہ دار یا دوست اُسے دیکھنے نہیں آیا۔ البتہ ایک لڑکی نے ٹیلیفون پر اُس کی حالت دریافت کی تھی۔ اور کہتی تھی کہ میں ابھی اُسے دیکھنے آرہی ہوں۔ لیکن آئی نہیں دوسری دفعہ ٹیلیفون کیا تو اُس نے بتایا کہ میں اُنہیں دیکھنے آتی تو سہی مگر وہ مجھ سے خوش نہیں تھے۔ اور میرے بتانے پر کہ اب وہ کسی سے بھی ناخوش نہیں رہے اُس کے مُنہ سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی جو میں نے بھی سُنی۔ پھر اُس لڑکی نے نجمی کی تجہیز و تکفین کے لئے روپے بھیج دیئے ورنہ اُسے جیبی کی سی کی موت نصیب ہوئی تھی ویسے ہی چندے کے روپوں کا کفن بھی ملتا۔ نوجوان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے اُن سے اُس کی قبر کا پتہ پُوچھا اور چل دیا۔ ڈاکٹر نے کہا" میرا خیال ہے کہ وہ نجمی نہیں تھا تاہم میں نے اُس کا فوٹو کھینچ لیا تھا تا کہ اگر اُس کے رشتہ دار وغیرہ آئیں تو پہچان سکیں" نوجوان نے ڈاکٹر سے فوٹو دکھانے کے لئے نہیں کہا۔ وہ وہاں سے سیدھا تار گھر پہنچا اور مرنے والے کے باپ کو تار دے دیا۔ تار دے کر اُس نے قبرستان کا رُخ کیا۔ یہ قبرستان نیا قبرستان تھا جو نئے زمانے کے اصُولوں پر بنایا گیا تھا۔ ہر طرف پھُولوں کی بیلیں تھیں اور پودے تھے اور ہر قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا پتھر نصب تھا جس پر صاحب قبر کا نام اور ایک آدھ فقرہ لکھا تھا جس سے اُس کی زندگی کے حالات پر روشنی پڑتی تھی۔ یہ بتائی ہوئی نشانیوں کو دیکھتا ہُوا نجمی کی تُربت پر پہنچا۔ اُس کے پتھر پر نام کے علاوہ یہ لکھا تھا" اُس کی آرام گاہ جسے اس دُنیا میں آرام نہیں ملا"۔ اس نے نہایت خلوص کے ساتھ فاتحہ پڑھی۔ کچھ دیر مرنے والے کے تصوّر میں بیٹھا رہا اور پھر اور قبروں کے کتبے پڑھنے لگا اور کتبے پڑھتے پڑھتے کچھ دُور چلا گیا۔ یکایک اُس نے دیکھا کہ ایک لڑکی اُس طرف آرہی ہے۔ وہ اُس کی آرام گاہ پر آئی جسے اس دُنیا میں آرام نہیں ملا تھا اور آکر پھولوں سے بھرا ہُوا رومال اُس کی تُربت پر اُلٹ دیا۔ پھر دونوں ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھنے لگی۔ نوجوان آہستہ آہستہ پودوں کی آڑ لیتا ہُوا اُس کے قریب آگیا اور پودوں کے پیچھے ہی سے دیکھنے لگا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ اُس نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا کہ آنسہ ہے۔ وہ آنسہ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ڈاکٹر کی زبانی لڑکی کے ٹیلیفون کرنے کے متعلق سُن کر اُسے خیال آیا تھا کہ ہو نہ ہو آنسہ ہی نے ٹیلیفون کیا ہوگا۔ اب آنکھوں دیکھ کر بالکل

ہی یقین آگیا۔ آنسہ فاتحہ پڑھ کر تربت کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور کہنے لگی "نجمی مجھے معاف کردو۔ نجمی میں صدقِ دل سے تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ جب تک تم معاف نہ کردو گے جب تک میرا دل اس بات کی گواہی نہ دے گا کہ تم نے مجھے معاف کردیا میں اسی طرح ہر روز تمہاری قبر پر آتی رہوں گی اور روتی رہوں گی ——— نجمی کیا تم یہ برداشت کرسکو گے؟ پھر بولتے کیوں نہیں؟ کہو کہ میں نے تمہیں معاف کردیا۔ اٹھو مجھے اپنے پاؤں سے اٹھا کر ——" بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ نوجوان کے بھی آنسو بھر آئے لیکن وہ ساکت و صامت کھڑا دیکھتا رہا۔ نہ اُس کے سامنے آیا اور نہ اُس سے کوئی بات کی۔

دوسرے دن آنسہ کو پھر ایک خط ملا۔ جسے پڑھ کر وہ سراپا حیرت و استعجاب میں ڈوب گئی۔ لکھا تھا:۔

"میری تمناؤں کی ملکہ!

کل کا دن میرے لئے انتہائی خوش قسمت دن تھا۔ اور یہ دن مجھے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک یاد رہے گا۔ کل میں نے اپنے کانوں سے آپ کو اپنے لئے نالہ و فریاد کرتے سُنا ہے۔ کل میں نے اپنی آنکھوں سے آپ کو اپنے لئے آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ کسی محبت کرنے والے کی اس سے زیادہ اور کیا معراج ہوسکتی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اُسی وقت آپ کے سامنے آجاؤں اور آپ کے رنج و غم کو آنِ واحد میں دُور کردوں لیکن اچانک سامنے آنے سے ڈر تھا کہ آپ کے نازک دل کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔

میں نے بھی اپنی موت کی خبر حیرت سے پڑھی تھی۔ آپ نے میرے اس قدر عاجزانہ خط کا بھی جواب نہ دیا تھا تو میں اس کا غم غلط کرنے کے لئے چھٹی لے کر وطن چلا گیا تھا۔ جب میں نے اخبار میں پڑھا "مشہور افسانہ نگار کو حادثہ" اور پھر نیچے اپنا نام لکھا دیکھا تو سخت تعجب ہُوا کہ ہسپتال والوں کو یہ مغالطہ کیسے ہُوا۔ لہٰذا کل یہاں پہنچ کر معلوم ہُوا کہ اس حادثہ کا شکار میری بجائے میرا ایک بدنصیب دوست ہُوا تھا اور اُس کی جیب سے چونکہ میرے نام کے ملاقاتی کارڈوں کا بنڈل نکلا تھا اس لئے اُنہوں نے اُسے ہی نجمی سمجھ لیا تھا۔ اِن ملاقاتی کارڈوں کا آرڈر میں نے ایک پریس کو دیا تھا اور گھر جاتے ہوئے میں مرحوم سے کہہ گیا تھا کہ پریس والوں سے لے کر میرے پاس بذریعہ پارسل بھیج دے۔

مجھے آپ کا غصے سے بھرا خط بھی یہیں آکر ملا۔ جو ہستی ایسا سخت خط لکھ سکتی ہو اُس کے لئے بھی اپنے ناکام کی موت اتنی زیادہ پریشانی اور رنج کا باعث ہوسکتی ہے۔ اور یہ بات تو کبھی میرے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی کہ جس کا سر آپ نے بیسیوں مرتبہ ٹھکرایا، اُسی کے پاؤں میں بیٹھ کر آپ معافی مانگیں گی۔ کل آپ کے آنسو دیکھ دیکھ کر اور آپ کی فریاد سُن سُن کر مجھے ایک خاص قسم کی روحانی خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ گو میں خود بھی آنسو ضبط نہ کرسکا۔ لیکن کوئی اور موقع ہوتا تو آپ کو اس حال میں دیکھ کر میں اپنے بال نوچ لیتا ———"

آنسہ نے یہاں تک ہی خط پڑھا تھا کہ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

ظفر واسطی

تأثراتِ اختر

نظر محوِ کمالاتِ محبت ہوتی جاتی ہے!
ہر اک تصویر اب تیری ہی صورت ہوتی جاتی ہے

یہ کیا بات آج اے اشکِ ندامت ہوتی جاتی ہے
کہ جو تقصیر ہے شایانِ رحمت ہوتی جاتی ہے

دعائیں کیوں نہ دوں تیری عنایاتِ تغافل کو
مری دنیا محبت ہی محبت ہوتی جاتی ہے

خبر بھی ہے تجھے او ہجرِ پیہم بخشنے والے
کہ ہر دوری ترا پیغامِ قربت ہوتی جاتی ہے

معاذاللہ آدابِ محبت اے معاذاللہ
کہ میرا شکر بھی کرنا شکایت ہوتی جاتی ہے

محبت کا یہ عالم ہے، نہ جانے کون سا عالم؟
ہر اک شے میری آغوشِ محبت ہوتی جاتی ہے

مبارک ہو محبت کا یہ عہدِ زندگی اختر
کہ ہر تازہ مصیبت اک مسرت ہوتی جاتی ہے

سیدہ اختر

غزل

سکونِ قلب کی صورت فراہم ہوتی جاتی ہے
خوشا قسمت طبیعت مائلِ غم ہوتی جاتی ہے

اِدھر تو ہر نفس مصروفِ شرحِ زندگانی ہے
اُدھر تحریرِ قسمت اور مبہم ہوتی جاتی ہے

ملا تھا پہلے دل اب درد بھی محسوس ہوتا ہے
ہمارے عشق کی دنیا منظّم ہوتی جاتی ہے

وہی شیشہ وہی ساغر وہی ساقی وہی محفل
مگر کیوں شانِ محفل دم بہ دم کم ہوتی جاتی ہے

زبانِ اشک سے شکوہ کسی کی بے وفائی کا
بہت گستاخ محسن چشمِ پُرنم ہوتی جاتی ہے

محسن اعظم گڑھی

کنگال

افراد

منشی پریم چند - اپنے عہد کے ایک جلیل القدر مختصر افسانہ نویس
گوما - منشی پریم چند کی نوکرانی
اکسٹراز: ڈاکٹر، نرسیں، چپراسی

آغا جان - منشی پریم چند کے رفیق
انبا پرشاد - ایک فلم کمپنی کے ترقی پسند ہدایت کار
زمانہ: ۱۹۳۵ء

نوٹ :- اس تمثیل کے کردار منشی پریم چند جی واقعے کے مطابق اصل نہیں ہیں، بلکہ جان گالزوردی کے ایک مختصر افسانے کے کردار خصوصی کا prototype ہیں۔

پہلا منظر

منشی پریم چند — اُدھیڑ عمر کے ایک نحیف آدمی جن کے بدن پر گوشت کم اور ہڈی زیادہ ہے۔ یہ اپنے وطن کے فاقہ کشوں کی نمائندگی کا حق رکھتے ہیں۔ کمرے میں مونڈھے سے ٹیکا لگائے بیٹھے ہیں۔ بے ترتیب کتابوں اور کاغذوں کا انبار گھر اور باہر کی گرد سے اٹا پڑا ہے۔

منشی جی چشمہ چڑھائے، گاندھی بھنڈار کی خالص کھادی کی پوشاک پہنے ترنگی شریعت کی ترجمانی کر رہے ہیں — آہ، سرمایہ داروں کی اشتراکیت پسندانہ ترنگی شریعت! لکھنے میں مصروف ہیں۔ سیاہی میں بھیگی ہوئی اُنگلیوں نے ماتمی کفن پہن لیا ہے۔ حالت بے شدہ ہے۔ خادمہ مٹی کی کُٹیا میں چھاچھ بھر کر پاس لا دھرتی ہے اور دبے پاؤں لوٹ جاتی ہے۔ منشی جی پونے تین گھنٹے بعد لکھنا بس کرتے ہیں۔

منشی پریم چند - اُف! لکھتے لکھتے ایک دم تیس صفحے لکھ گیا۔ توبہ! درد کے مارے اُنگلیاں میری جان کو کوستی ہوں گی۔ آدمی کتنا موذی ہے۔ تشدد کے بغیر جی نہیں سکتا۔ بھوک زناٹے سے لگ رہی ہے۔ چھاچھ آگئی ہے، کام چل جائے گا۔

(چھاچھ اُٹھا کر پی لیتے ہیں)

ایک ہم ہیں کہ ہمارا جینا مستقل ماتم ہے اور ایک وہ ہیں جن کا مرنا جشن سے کم نہیں۔ ہم تو یوں دن تیر کر کے قدرت پر احسان کرتے ہیں ورنہ خودکشی کر لیتے۔ سرمائے کی طبقاتی تمیز کس قدر لغو ہے۔ میری نئی کہانی کا کردار پورا ابلیس ہے جس کے تکلفات پر ہوس کا مُنہ بند نہیں ہوتا۔ آخر یہ کیوں؟ مادی دُنیا میں قریب قریب سب کا درجہ برابر ہے۔ سب کو اپنی اپنی ضرورت کی اشیاء ملنی چاہئیں! لیکن کون سُنتا ہے ہماری؟ آہ!

(گوما آجاتی ہے)

گوما - کیا لکھا منشی جی آپ نے؟

منشی پریم چند - یہی ایک زردار کی نئی کہانی،

گوما - نئی کہانی! وہ کیا؟

منشی پریم چند - ایک امیر کبیر آدمی ہے۔

گوما - آدمی؟ کیا امیر کبیر آدمی ہو سکتے ہیں؟

منشی پریم چند - ہاں گوما! آدمی ہونے کا اجارہ تو انہیں کے پاس ہے

ورنہ نہیں اگر حیوان کہیں تو حیوانات کی توہین ہو گی۔

گوما۔ بے شک۔

منشی پریم چند۔ ہاں تو ایک امیر کبیر آدمی ہے۔ یہی جاگیر دار ــــ سرکار کی بخشی ہوئی ایکڑوں کے مُنہ زمین اور خدا کے پیدا کئے ہوئے غریبوں کی برگشتہ قسمتوں کا بیرحم مالک۔

گوما۔ اچھا! آپ کا مالک تو نہیں؛

منشی پریم چند۔ نہیں گوما! میں ایسے ذلیل انسان کی ملکیت سے الگ ہوں۔ اس جاگیردار کی سنو!

(گوما جھٹکا مار کر کرسی سے پرے ہوتے فرش پر بیٹھ جاتی ہے)

گوما۔ جی،

منشی پریم چند۔ ایک دن کیا ہوا، یہ اپنی حویلی سے باہر نکل آیا جسے وہ بجا طور پر جنت خیال کرتا تھا۔ باہر تو تمہیں علم ہے دوزخ ہی ہو سکتی ہے کیونکہ بھوکے کسانوں کی بستی بھول کر بھی جنت نہیں کہلا سکتی۔

گوما۔ ہاں، تو وہ دوزخ میں جھلسنے نکل آیا؛

منشی پریم چند۔ ہاں گوما! دوزخ میں نکل آیا جو اس کی جنت کے ٹھیک پہلو میں تھی اور جہاں اللہ میاں کے سزا یافتہ دوزخی بھی آنا قبول نہیں کریں گے۔

گوما۔ تو کیا اللہ میاں کی دوزخ انسانی دوزخ سے بہتر ہے؛

منشی پریم چند۔ ہاں تو، وہ اس لئے بہتر ہے کہ گناہگاروں کے لئے ہے اور یہ اس لئے نہیں کہ بے گناہوں کے لئے ہے۔ خیر، جاگیردار کھیتوں کو چل دیا۔ کسان کے لہو پسینے کی قیمتی کمادے انہیں نشوونما ملی تھی، اس کا بدن گھل گھل کر اور اس کی زندگی مٹ مٹ کر انہیں تنومند کر رہی تھی! ہاتھوں اُونچے پودے بچارے غریب کسان کے مغرور فوجی تھے لیکن انہیں جاگیردار کی خاطر کٹ کر کھیت ہونا تھا۔ کسان نے اپنی جان ان میں ڈال دی تھی، تاہم گوما! کسان کو کون پوچھتا ہے؛

گوما۔ وہ کیوں؛

منشی پریم چند۔ بس یونہی، اندھی دُنیا، مغروری تشدد اور بے پناہ طاقت کے گھمنڈ پر کسان کو روندے جا رہی ہے۔ یہ ہرے بھرے کھیت جنہیں کسان نے جنم دیا، جاگیردار کی بن پوچھے ملکیت ہیں۔ کسان کی مجال نہیں کہ ایک دانے کو بھی ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ جاگیردار سخت گیری کے شکنجے سے اس کی آنکھ پھوڑنے کو ہر لحظہ تیار ہے۔

گوما۔ منشی جی! یہ تو بڑا ظلم ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں؛

منشی پریم چند۔ گوما! علاج تو ہے لیکن طبیب ندارد، علاج کون کرے؛ دولتمندوں کے طبیب سبھی، غریبوں کا ایک بھی نہیں، ہاں تو سنو! راہ چلتے جاگیردار کو کسان کی بیوی ملی۔ بدقسمتی سے وہ کسی پری کی نسل سے تھی۔ اتنی حسین کہ بس قیامت! لیکن وہ قلاش تھی اور قلاش کے لئے ہر نعمت ایک لعنت ہے۔

گوما۔ بے شک، لیکن منشی جی! وہ عورت آپ کو تو خوب پسند ہو گی؛

منشی پریم چند۔ نہیں، گوما! مجھے عورتوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں۔ عورت پھول بھی ہے اور کانٹا بھی، کیا خبر وہ کب کیا بن جائے؛ خیر، عورت جوان اور رسیلی تھی۔ اس نے منحوس جاگیردار کو دیکھتے ہی نہایت ادب سے سلام کیا۔ یہ جانو کہ اس کے دل پر جاگیردار کی ہیبت شمشان بھومی کے بھوتوں کے بعد دوسرے درجے پر تھی۔ اس نے سلام کے بعد گھونگھٹ

نکال لیا اور اپنی راہ لی۔ لیکن جاگیردار مرمٹا۔ اس نے گنوارن کو ٹھہرا لیا اور لگی لپٹی باتیں کرنے لگ گیا۔ گنوارن کو جاگیردار کی نیت صاف نہ معلوم ہوئی۔ وہ بھانپ گئی کہ خیریت نہیں، لیکن عورت ذات تھی۔

(منشی جی یہاں ذرا رُک گئے)

گوما! عورت کو آبرو عزیز ہے کہ یہ اس کے مرنے جینے کی کائنات ہے۔ وہ بے عزت ہونے کو موت گنتی ہے۔

گوما۔ پھر وہ جاگیردار سے کیونکر بچ نکلی ہوگی؟

منشی پریم چند۔ کیونکر؛ اس نے سر پر رکھی ہوئی چھاچھ کی ہنڈیا اس کے مُنہ پر دے ماری اور بھاگ گئی ـــــ بے تحاشا،

گوما۔ جاگیردار تو مرلیا؛

منشی پریم چند۔ مرلیا؛ وہ آتشگیر مادے کا ڈھیر بن گیا ـــــ غصے نے اس کے نتھنے پھلا دیئے۔ اس کا تیز سانس آگ اُگلنے لگا۔ اس کی آنکھیں سلگ گئیں اور اس کے تپتے ہوئے بدن کا رُواں رُواں جلتے مکان کے شعلے بن گیا۔

گوما۔ پھر کیا ہُوا؛

منشی پریم چند۔ یہی کہ وہ بھسم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس نے برتت ضبط کا فائر پروف پہن لیا۔

گوما۔ بھلا ہُوا۔

منشی پریم چند۔ ابھی کہاں۔ ایک دن ہُوا، دوسرا ہُوا، تیسرا اور پھر چوتھے دن اس نے کسان کو بُلا بھیجا۔

گوما۔ گنوارن کی شکایت کے لئے؛

منشی پریم چند۔ نہیں گوما! اس بات کو تو وہ ایسے کھا گیا جیسے کھمن میں لپٹا ہُوا توس تھا۔ اس نے کسان سے دی ہوئی رقم کا مطالبہ کیا اور کہا کہ یہ نہیں تو تم جیل میں قید کی سزا بھگتو گے!

گوما۔ اُف!

منشی پریم چند۔ ہاں، ہاں، گوما! جب دُنیا کو پیسے کی ہوا نہ لگی تھی تو لوگ عاجز تھے اور جب اُنھوں نے پیسے کا مُنہ دیکھا تو وہ ان داتا کو بھول کر ان داتا بن گئے۔ نہیں نہیں، بلکہ شیطان کے نائب بن گئے۔ کسان اپنے لنگڑے بیل کی طرح گردن جھکائے لوٹ آیا۔ اسے وہم بھی نہ ہُوا کہ ان داتا نے اپنا بوجھ اس کی کڑیل بیٹھ پر رکھ دیا ہے۔ اس نے اپنے تئیں زمین کی چھاتی کا بوجھ خیال کیا۔ وہ مختصر سی مکانیت کے جھونپڑے میں پہنچا۔ دیکھو! گوما!

گوما۔ جی! منشی جی!

منشی پریم چند۔ خود غرضوں، نکھٹوؤں اور کام چوروں کے لئے ساری خدائی ہے اور جفاکشوں کے لئے پاؤں دھرنے کی جگہ نہیں۔ آہ! ہمارا کسان! کسان کو اس کی نصف بہتر نے افسردہ نگاہوں سے دیکھا، دل کی پوتھی اتھل پتھل کی۔ اصل بات کا پتہ چلا۔ وہ غیرت مند عورت اپنے مجازی خدا کو تسلی دے کر اندھیری کوٹھڑی میں گئی اور جھٹ لوٹ آئی۔ جاگیردار کے ہاں پہنچی۔ ساری حویلی شراب خانہ بن رہی تھی، شراب کی بو سے ہوا سٹر رہی تھی۔ جاگیردار خوش ہُوا، شیطان کے سامنے حور آگئی۔ اس نے سوچا، تیر ٹھکانے بیٹھا۔ شراب کے برتنوں کو پھینک کر جھٹ اُٹھا اور عورت کی جانب بڑھا لیکن عورت کی پاکبازی کو میلا کرنے سے پہلے جاگیردار کی لالچی توند پر درانتی چل گئی اور آنتوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔ یہ ہے مزدور کی

قسمت! عورت بھی چند سے لگی اور مزدور دیوانہ ہو کر زندگی کی خاک چھانتا رہا۔ قدرت کے کارخانے میں ایسی کہانیوں کی کیا کمی ہے؟

گوما۔ اف! منشی جی! بڑی دردسری کی ہے۔ لیکن اس سے آپ کو کیا؛

منشی پریم چند۔ کیوں؛

گوما۔ اس لئے کہ آپ اتنے بڑے کہانیاں لکھنے والے بھی ہوئے لیکن یہاں جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔ زندگی کا آرام میسر نہیں۔ آج ہی کی سن لیجئے! صبح کا ناشتہ سوکھی چھاچھ سے ہوا، دوپہر کے کھانے کا پتہ بھی نہیں۔ روٹی گھی میں چپڑ کر آگے رکھ دوں گی، ورنہ بھجیا کا انتظام نہیں۔

منشی پریم چند۔ گوما! آخر پیدا ہوئے ہیں، دن بھی تو پورے کرنے ہیں۔

گوما۔ اے واہ! یہ کیا دن پورے کرنا ہوئے؛ اس سے تو آپ قلی بن جاتے! چار پیسے کمانے کی گوں کے ہوتے۔

منشی پریم چند۔ واہ عجب اوندھی کھوپڑی ہے تمہاری! اس میں سے بھوسا نکال کر باہر پھینکو!

گوما۔ کیوں؛ قلی بننا کوئی عیب ہے؛

منشی پریم چند۔ نہیں، یہ بات نہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میری قسمت میں قلی بننا نہیں تھا۔

گوما۔ اچھی ہے آپ کی قسمت جس میں فاقہ، بیماری اور بے آرامی کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

(باہر ہرکارہ آواز دیتا ہے)

منشی پریم چند۔ دیکھنا! خط آیا ہے۔

(گوما باہر جا کر خط لے آتی ہے)

گوما۔ ان موئے خط والوں نے ستا رکھا ہے۔ ہوگا کسی اخبار والے کا! مزدوری دیتے دوا نئے کچھ ہیں نہیں اور جان ہلکان کرانے کو ہر دم تیار ہیں۔

(گوما خط لا کر پکڑا دیتی ہے اور خود رسوئی میں چلی جاتی ہے)

منشی پریم چند۔ (خط کھول کر پڑھتے ہیں) اوہ! ضیا کے ایڈیٹر صاحب کا خط ہے۔ بچارے بڑی عزت سے پیش آتے ہیں۔ کیا لکھتے ہیں:

"مکرم و معظم قبلہ منشی صاحب مدظلکم!

تسلیمات!

"ضیا" کے حقیر کالم ایک عرصے سے آپ کے گراں قدر افسانوں کے محتاج ہیں۔ از رہِ عنایت کوئی تبرک ارسال فرمایئے! سالگرہ نمبر کی تدوین ابھی سے ہو رہی ہے۔ مضامین کی کتابت شروع ہے۔ آپ کی نگارش جمیل کی ازحد تنگی ہے۔ ہمارے خریدار ادارے بھر کو تنگ کر رہے ہیں۔ توجہ فرمایئے! کوئی کار لائق ہو تو ارشاد کیجئے۔ بندہ حاضر ہے۔ والتسلیم

نیازمند

ش۔ ع۔ عظمت"

انہیں یہی افسانہ ابلاغ کر دوں جو ابھی ابھی بیٹھے بیٹھے گھڑ کر لکھا گیا ہے۔ لیکن ٹکٹ تو ہے نہیں، پھر؟ بس بیرنگ بھیج دیتا ہوں۔

(منشی جی افسانہ لفافے میں بند کر، چھڑی ہاتھ میں لے باہر چل دیتے ہیں تاکہ لفافہ پوسٹ بکس میں پھینک آئیں)

دوسرا منظر

(آغا جان ــــ ایک خلیق اور قدر شناس انسان کمرے میں تنہا بیٹھے ہیں۔ سامنے حقہ دھرا ہے، منہ میں نیچوان لئے گڑگڑا رہے ہیں۔ عینک لگائے خط پڑھ رہے ہیں)

"محترم بندہ جناب آغاجان صاحب مدفیوضکم!

آداب عرض!

"ضیا" کا سالنامہ زیر ترتیب ہے۔ ملک کے گرامی قدر ادبا کی نگارشیں موصول ہو لیں لیکن محترمی پریم چند جی نے توجہ نہیں فرمائی۔ آپ کے افسانے کی جگہ محفوظ ہے۔ براہِ کرم معاونت کیجئے اور ضیا ر کے لئے کوئی افسانہ بھجوائیے! ممنون رہوں گا۔

نیازمند

ش، ع۔ عظمت"

آغاجان۔ (زیر لبی سے) کیسے ہیں یہ اخباری لوگ! اس غریب کی جان پر بنی ہے اور یہ دُنیا بھر کے بے فکرے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہیں۔ کاٹھ کے اُلّو! امداد کرنے سے تو رہے اُلٹے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔

(خط چلم پر رکھ دیتے ہیں ―― دھواں ہی دھواں ہو جاتا ہے۔ منشی جی آ جاتے ہیں۔)

منشی پریم چند۔ اف! آپ نے تو دھواں ہی دھواں کر دیا۔ کس کا دل جلا ہے؟

آغا۔ ایک ایڈیٹر کا۔

منشی پریم چند۔ کس ایڈیٹر کا؟

آغا۔ اجی! کیا کہوں اب؟ ان ایڈیٹروں پر خدا کی پھٹکار! "ضیا" کے ایڈیٹر نے مجھے خط بھیج دیا۔ میں نے آگ کی گود میں رکھ دیا۔

منشی پریم چند۔ کیوں کیا گالی گلوچ کا خط تھا؟

آغا۔ نہیں، ایسا تو نہیں تھا بلکہ مجھ سے فرمائش تھی کہ میں "ضیا" کے لئے آپ کو افسانہ بھیجنے کے لئے کہوں!

منشی پریم چند۔ اوہو! یہ بات تھی۔ میں انہیں افسانہ بھیج بھی چکا۔

آغاجان۔ ہیں،

منشی پریم چند۔ ہاں، افسانہ چھپ جائے گا ویسے پڑے پڑے تو دیمک کی نذر ہوتا۔

آغاجان۔ خیر، آپ کی صحت کیسی ہے؟

منشی پریم چند۔ بس ڈانوا ڈول سی۔

آغا۔ آپ تو روز بروز کمزور ہوئے جاتے ہیں۔

منشی پریم چند۔ ہاں، آغاجان!

آغا۔ آپ کی زندگی کو گھن لگ رہا ہے۔

منشی پریم چند۔ کیا شک ہے اس میں۔ ایکس رے کرایا چاہتا ہوں۔

آغا۔ تجھے کسی شدید مرض کا گمان ہے۔

منشی پریم چند۔ شدید مرض؟ تھائیسس کا مریض ہوں۔

آغا۔ تھائیسس؟ اُف! اُف!

منشی پریم چند۔ ہاں، ہاں۔ مرحوم مسیح الملک جب کانگرس کے لئے اشریف لائے تھے تو پہلی مرتبہ مجھے تعارف کا اتفاق ہُوا۔ آپ نے مجھ سے صحت کی خرابی کا فرمایا تھا لیکن قلمی مصروفیت نے کچھ نہ کرنے دیا اور پھر کچھ مالی آشوب بھی رہا۔

آغا۔ پھر اب کیا ہوگا؟

منشی پریم چند۔ وہی جو آج تک نہ ہُوا۔ دیدوں کا گرم پسینہ ٹپک ٹپک کر خشک ہو گیا، لہو کی بوندیں گنتی کی رہ گئیں۔ مجھے اپنے ناصح مسیح الملک مرحوم کی راہ لینا ہے۔

آغا۔ توبہ! توبہ! خدا خیر کرے!

منشی پریم چند۔ نہیں، نہیں۔ آغاجان! مجھے مرنے کا غم نہیں اور نہ سمجھداروں کو اس سے غم ہُوا ہی ہے۔ مجھے اس بات کا غم ضرور ہے کہ میں صد کتاب مصنف نہ بن سکا۔ تاہم میں مرتے

دم تک قلم گھسیٹتا رہوں گا!

آغا جان۔ ناقدری میں ایسا کرنا گناہِ عظیم ہے۔

منشی پریم چند۔ آغا جان! یہ گناہ جانسوز ہے۔ ہزار ثواب کا حاصل کرنا سہل ہے لیکن ایسا گناہ زندگی کی ترازو میں تل کر ملتا ہے۔ اس کی قیمت میری زندگی نے چکائی ہے۔ مجھے یہ گناہ اونے پونے نہیں ملا۔

آغا جان۔ میں اب کیا کہوں؟ آپ تو بلاغت پر اُتر آئے۔

منشی پریم چند۔ خیر چھوڑیے اس اَلابلا کو۔ مژدہ سنیئے! میں نے ایک فلمی کہانی لکھ ماری ہے۔

آغا جان۔ فلمی کہانی؟

منشی پریم چند۔ جی ہاں، ایک بالکل ارتقائی چیز! یہی آج کے مزدور کا عروج۔

آغا جان۔ ماشاءاللہ! کیسی ہے یہ؟

منشی پریم چند۔ کیسی ہے؟ افسانے میں تین عناصر جذب ہیں۔ خلوص اور اس کے ضمن میں ایمان اور دریا دلی۔ ہمارا مزدور ان خوبیوں کا حامل ہے۔ اس کے ہاتھ میں رگِ سرمایہ دار ہے۔ افسوس! غیر حساس کلوں نے اس کے آقا کو آہنیں دل کر دیا۔ لیکن کلیں تو پھر بھی مفید ہیں اور سرمایہ دار؟

آغا جان۔ سرمایہ دار؟ اپنے ان داتا مزدوروں کی ننگی کھوپڑیوں پر پھٹنے والا ہیبت ناک بم۔

منشی پریم چند۔ بجا ہے آپ کا خیال۔ ہمارا مزدور ایک سرمایہ دار کی کارگاہ میں ملازم ہے۔

آغا جان۔ ہوں۔

منشی پریم چند۔ سرمایہ دار کے دن پورے ہو لئے، وہ اگلے جہان سدھارا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ——— دو بھائی بہن مل سنبھالنے کو رہ گئے۔ آغا جان! بھائی بہن کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ ایک کی اولاد ہوں لیکن نہیں، میرے نزدیک یہ معنی غلط ہیں۔ میں تو آپس میں نیک برتاؤ رکھنے والوں کو بھائی بہن کہوں گا اور اگر یہ نہیں تو ان کا بھائی بہن ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ لیکن ان کی سُنیئے! بھائی ایک مغرور، غیر حساس اور خود پرست سرمایہ دار نکلا؛ اس کی بہن ایک نیک دل عورت، مزدوروں کی طرح کام کرنے والی اور ہمدردی کی قیمت جاننے والی۔ ہمارے مزدور سے اسے محبت ہو گئی۔

آغا جان۔ محبت؟ غضب! غضب! کہیں سرمایہ داروں کا طبعی گروہ آپ پر مقدمہ نہ چلا دے۔ آپ نے مزدور کے ہاتھوں ان کی ناک کٹوا دی۔

منشی پریم چند۔ یہ تو تب ہے کہ افسانہ فلمایا جائے۔

آغا جان۔ فلمایا جائے؟ آپ ملک کے جلیل القدر ادیب ہیں۔ فلم کا آپ نے پہلی دفعہ خیال کیا ہے۔ ضرور آؤ بھگت ہو گی۔

منشی پریم چند۔ چھوڑیئے ان طفل تسلیوں کو۔

آغا جان۔ نہیں نہیں مجھے ذرا پڑھ کر سنائیے۔

منشی پریم چند۔ اجی ایسی دردِ سری کون کرے؛ مجھے ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے۔ یہ مسودہ ہے۔ آپ اسے فرصت نکال کر پڑھ لیجیے! ڈیڑھ سو صفحات کا پلندہ ہے۔ ہفتے بھر تک انگیٹھی سلگتا رہے گا۔

آغا جان۔ دیکھا جائے گا۔

منشی پریم چند۔ جی ہاں۔ میں اب جاتا ہوں۔

آغا جان۔ بہتر۔

(منشی جی اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ آغا جان پلندہ سنبھال کر فلمی افسانہ پڑھنے لگ جاتے ہیں)

تیسرا منظر

(ایک فلم کمپنی ——— ڈائریکٹر انبا پرشاد اپنے کمرے میں، آغا جان داخل ہوتے ہیں)

ڈائریکٹر انبا پرشاد۔ آغا! آپ تشریف لے آئے۔ ٹیلیفون سے آپ کی آمد کا پتہ چل گیا تھا۔

آغا جان۔ جی ہاں، مجھے بھی آنے ہی کا فکر تھا۔

ڈائریکٹر انبا پرشاد۔ فرمایئے! منشی جی نے کیا افسانہ سپردِ قلم کیا ہے؟

آغا جان۔ کنگال۔ بلاشبہ ایک اچھوتا خیال۔

ڈائریکٹر انبا پرشاد۔ واقعی فلم کے لئے یہ نہایت کامیاب نام ہے۔ تو یہ فردِ واحد کا افسانہ ہے؟

آغا جان۔ جی! ہاں،

ڈائریکٹر انبا پرشاد۔ لیکن یہ فرمایئے کہ منشی جی کا کنگال فی الحقیقت کنگال ہے؟

آغا جان۔ مطلق نہیں۔ اس کا کنگال پن تو ایک بدنما داغ ہے جس سے معاشرہ کی جبیں شرمسار ہے۔ وہ کنگال کہلاتا ہے۔ لیکن کنگال نہیں۔ اس کے پاس انسانیت کی لازوال دولت ہے ——— محبت اس کی گرانمایہ جنس ہے، اخلاقی طور پر وہ مخلص مزدور ہے لیکن اس کے یہ محاسن کسی زردار کے صوفے قالین اور موٹر کاریں نہیں جو اس کے کنگال پن کا عیب چھپا سکیں۔

ڈائریکٹر انبا پرشاد۔ بجا ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے منشی جی کا کنگال حقیقتہً کنگال نہیں بلکہ کنگال تو آج کا زردار ہی ہو سکتا ہے جس کے صوفے قالین اور موٹر کاریں اس کے اخلاقی محاسن میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اخلاق کا دیوالہ دینے کے بعد بھی زردار کنگال نہیں۔ تعجب ہے ہماری معاشرہ کی ناانصافی پر! مجھے کامل یقین ہے کہ منشی جی نے ایک مثالی چیز پیدا کی ہوگی؟

آغا جان۔ بالکل مثالی چیز، یوں کہئے کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے۔ مزدور کے باب میں منشی جی کا مطالعہ ازحد وسیع ہے کیونکہ خود ایک مزدور ہیں ——— قلمی مزدور،

ڈائریکٹر انبا پرشاد۔ افسوس ہے کہ منشی جی جیسے بے مثال ادیب کو ناقدری کے ہاتھوں رگیدا جائے اور ملک بے حس رہے۔

آغا جان۔ ملک کو کیا خبر کہ ہندوستان کا طالسطائی بھوک، آفت اور رنجیدگی کا نوالہ بنا ہے۔

ڈائریکٹر انبا پرشاد۔ میں چاہتا ہوں کہ منشی جی کا افسانہ فلماؤں! ملک میں جدید ادب کی بڑی مانگ ہے لیکن بہتات سے میسر نہیں آتا۔ کنگال ضرور جدید ادب کا علمبردار ہے۔ میں اس سے ملک کی فضا میں ذہنی تبدیلی کر دوں گا۔

آغا جان۔ جی، ہاں، آپ دیکھئے گا کہ کنگال سے ایک طرف تو زردار تشدد کی گمراہی سے توبہ کرلے گا اور دوسری طرف مزدور آرام کی دنیا پالے گا۔ اعتدال اور مساوات کا زریں پیغام دنیا بھر تک پہنچے گا کہ یہ کنگال کا مقصدِ زندگی ہے۔

ڈائریکٹر انبا پرشاد۔ اعتماد کیجیے کہ میں منشی جی کو غم کا نوالہ نہیں بننے دوں گا! میں ان کے افلاس کا ایک قلم خاتمہ کردوں گا۔ میں انہیں آفتاب بنا کر چمکا دوں گا! ہندوستان کا طالسطائی فاقوں نہیں مرے گا۔

آغاجان - آپ کا شکریہ۔

ڈائرکٹر انبا پرشاد - مجھے مسودہ دے جایئے تاکہ میں فلمی نقطۂ نظر سے اسے جانچوں اور ضروری ترمیم کروں!

آغاجان - یہ لیجیے مسودہ!

ڈائرکٹر انبا پرشاد - جی! بس! میں بہت جلد آپ سے ملوں گا۔

آغاجان - بہتر! میں آپ سے دوبارہ مل کر خوش ہوں گا۔ آداب عرض!

(آغاجان چلے جاتے ہیں)

آخری منظر

(ہسپتال کا ایک الگ تھلگ بالائی کمرہ - ٹی بی وارڈ)

منشی پریم چند لیٹے ہیں، بدن نحیف، چہرہ سوکھی گھاس کی طرح مرجھایا ہوا اور ہونٹ سوکھ کر کھنک ہو گئے ہیں انہیں کمبل میں دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ کمزور زندگی موت کا کمبل اوڑھے سستا رہی ہے۔ کبھی کبھی نرس اور دوسرے مددگار دیکھ بھال کے لئے آ جاتے ہیں۔

گوما قریب بیٹھی ہے۔ کھڑکی سے صاف دھوپ اور ہوا داخل ہو رہی ہے۔

منشی پریم چند - دھوپ چڑھی ہے لیکن میری زندگی چھاؤں چھاؤں جا رہی ہے۔ آخر ڈھلے گی۔

گوما - منشی جی ہمت نہ ہاریئے۔

منشی پریم چند - نہیں، گوما! میں آج تک بے ہمت نہیں ہوا۔ مجھے بے ہمتی سے واسطہ نہیں لیکن اب مجھے مرنا ہے۔ اب ہمت کی ضرورت نہیں۔

گوما - منشی جی! مجھے آپ کا بڑا خیال ہے۔ آپ سے دنیا نے بڑی بے دردی کی۔

منشی پریم چند - خیر، گوما! گیہوں کے ساتھ گھن پستے چلے آئے ہیں۔ یہ ازل سے لکھا گیا ہے لیکن جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب اور کچھ نہ ہوگا۔ میری موت دنیا کی بیدردی کا ہاتھ شل کر دے گی ظالم اپنا سر پیٹ لے گا اور سفاک دنیا سٹپٹائے گی کیونکہ ان کا لقمہ موت ہضم کر چکی ہو گی۔

گوما - بڑے دکھ کی بات ہے یہ!

منشی پریم چند - دکھ کی بات؟ گوما! مرنا دکھ کی بات نہیں، جینا دکھ کی بات ہے۔ میں جینے کو خیرباد کہہ رہا ہوں، موت کا مہمان ہوں۔ موت میری منتظر ہے۔ میں اسے زیادہ دیر تک انتظار کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میری معزز میزبان اب میرے بغیر نہیں جی سکتی۔

گوما - بھگوان کرے آپ اور جئیں!

منشی پریم چند - گوما! مجھے مرنے دو! یہ دنیا کارواں سرائے ہے ایک جاتا ہے تو دوسرے کو آنے کی جگہ ملتی ہے۔ گوما! مجھے مرنے دو تاکہ دوسرے جئیں! سمندر کنارے پہنچ کر لوٹنے کی آرزو کرنا بزدلی ہے۔ مرنے والے کو مرنے سے دلچسپی چاہیئے نہ کہ جینے سے۔ میں خوش ہوں کہ موت وقت پر پہنچی۔ میں اپنی زندگی کا کام ختم کر چکا ہوں۔ اب مجھے مرنے کی پوری فرصت ہے۔

گوما - اے، واہ! منشی جی! لوگ تو موت سے ڈرتے ہیں اور آپ اس سے نڈر ہیں۔

منشی پریم چند - بے شک! انسان کو اپنا فرض نڈر ہو کر ادا کرنا چاہیئے۔ مرنا ایک اہم فرض ہے۔ دیکھو کوئی آیا۔

گوما - آپ کے دوست آئے ہیں۔

منشی پریم چند۔ کون؟ آغا جان!

گوما۔ جی،

(آغا جان آجاتے ہیں)

آغا جان۔ اوہو، آپ ہر وقت اب لیٹے رہتے ہیں؟

منشی پریم چند۔ جی ہاں۔ فرصت کا یہ اچھا مشغلہ ہے۔ ابھی سے مشق کر رہا ہوں۔ آخر مجھے ہمیشہ کے لئے لیٹنا ہے۔

آغا جان۔ نہیں، نہیں۔ منشی جی! آپ کیوں لیٹیں۔ لیٹیں آپ کے دشمن!

منشی پریم چند۔ موت خوشامد پسند نہیں، کڑا دل رکھتی ہے، اور کبھی کوتاہی نہیں کرتی۔ دیکھئے! وہ زندگی کے تنفس کو سونگھ رہی ہے۔ ضرور اسے ڈس کر رہے گی۔

آغا جان۔ آپ تو موت سے بھی بڑھ کر تیزی کر رہے ہیں۔ ابھی موت دور ہے۔

منشی پریم چند۔ دور سہی، لیکن اس کی ایک ہی زقند زندگی کے تمام فاصلے طے کر جاتی ہے۔

آغا جان۔ خیر چھوڑیئے یہ دھنا سری! وہ جھانکیئے ذرا کھڑکی سے باہر! وہ کھلنڈرا لڑکا کس بے فکری سے کھیل رہا ہے۔

منشی پریم چند۔ کھیل رہا ہے! اس کی بھول ہے۔ زندگی کھیلنے کی چیز نہیں؛ سہنے اور برتنے کی چیز ہے۔

آغا جان۔ تاہم آپ کسی طرح موت کا خیال چھوڑ دیجئے! موت اپنا کام خود کرلے گی، آپ اپنا فکر کیجئے!

منشی پریم چند۔ مرنا میرا ہی تو کام ہے۔ دیکھئے میں کنگال ہوں گھیسو[1] نے اپنی بیوی کو کفن نہیں دیا، آپ مجھے ضرور دیجئے۔ کہیں یہ نعش بے کفن جھاڑیوں میں نہ پھنکے۔

آغا جان۔ لاحول ولا، آپ بھی غضب ڈھاتے ہیں۔ آپ کی تکلیفوں کا علاج ہو لیا۔ اب آپ کنگال نہیں رہے، بلکہ سونے چاندی میں تُلنے کو ہیں۔

منشی پریم چند۔ غالباً آپ میری نعش کے بارے میں یوں کہہ رہے ہیں۔ شکریہ!

آغا جان۔ خیر آپ کچھ سمجھئے! آپ کی زندگی کا دروازہ کھلنے کو ہے۔

منشی پریم چند۔ تاکہ موت اس میں داخل ہو۔

آغا جان۔ جی! نہیں، موت کو میں کان پکڑ کر جہنم رسید کردوں گا۔

منشی پریم چند۔ ماشاءاللہ!

(ہسپتال کا چپراسی ایک بڑے سائز کا لفافہ لےکر داخل ہوتا ہے اور منشی جی کے پاس میز پر دھر کر چلا جاتا ہے)

آغا جان۔ کیا ہے یہ منشی جی؟

منشی پریم چند۔ میرا اعمال نامہ ــــ اس میں ایکس رے کی تصاویر اور وارڈ انچارج ڈاکٹر تربینی پرشاد کا بیان ہے۔

آغا جان۔ ہوں، کیا لکھتے ہیں وہ؟

منشی پریم چند۔ کیا لکھتے ہیں؛ (تصاویر اور بیان کے قرطاس کو دیکھ کر) بایاں پھیپھڑا زہر آلود ہوچکا ہے، اس کے ساتھ دل نے بُرا اثر لیا ہے۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ حیاتین ب اور د کی کمی ہے۔ یہ کمی پوری ہوسکتی ہے۔

آغا جان۔ خوب، خوب۔ زندگی کے آثار باقی ہیں۔

منشی پریم چند۔ (تصاویر اور بیان ایک طرف رکھتے ہوئے) بے شک! میرے مرنے کے بعد بھی کائنات میں زندگی کے آثار باقی رہیں گے۔

آغا جان۔ آپ تو موت پر مرتے۔ جینے سے کیوں نفرت ہے؟

[1] منشی جی کے افسانے ـــ "کفن" کا کردار خصوصی

منشی پریم چند۔ نفرت تو نہیں تاہم یہ بھی ہے کہ اُلفت بھی نہیں اس لئے کہ جینے کا موسم گیا۔ بہرحال اپنے اپنے وقت پہ زیب دیتی ہے۔

(گوما اطلاع دیتی ہے)

گوما۔ ایک بھلے آدمی آپ سے ملنے آئے ہیں۔

منشی پریم چند۔ آجانے دو، بہتر تھا کہ قیامت کے دن ملتے۔ اب تو فرصت نہیں۔

(ڈائریکٹر انبا پرشاد داخل ہوتے ہیں)

آغا جان۔ آہا! ڈائرکٹر انبا پرشاد! آئیے! تشریف لائیے!

ڈائرکٹر انبا پرشاد۔ جی، حاضر ہوا۔

آغا جان۔ منشی جی! آپ ڈائرکٹر انبا پرشاد ہیں۔

منشی پریم چند۔ خوب، تشریف رکھئے!

ڈائرکٹر انبا پرشاد۔ (بیٹھتے ہوئے) آپ بے حد نحیف ہیں۔

منشی پریم چند۔ جی ہاں، یہ میرا ورثہ تھا، میں اسے سنبھالے رہا۔ اب موت کے ہاتھ سونپوں گا۔

ڈائرکٹر انبا پرشاد۔ میں تو زندگی کا پیغام دینے آیا ہوں۔

آغا جان۔ ضرور دیجئے!

ڈائرکٹر انبا پرشاد۔ آپ کا کنگال بے مثال ہے۔ میں اعتماد کرتا ہوں کہ مجھے اس کے فلمانے پر فخر ہے۔

منشی پریم چند۔ شکریہ۔

ڈائرکٹر انبا پرشاد۔ جی! نہیں، شکریہ مجھے ادا کرنا ہے۔ میں اس کے ذریعے فلمی دنیا کا بابا آدم بدل دوں گا۔ یہ جدید ادب کی اہم کڑی ہے۔ سرمائے کا بدنما ایوان خاک پر آ رہے گا اور محنت کی مخلصانہ بنیادوں پر ایک خوشنما عمارت استوار ہو گی۔

منشی پریم چند۔ نیک فال ہے۔

ڈائرکٹر انبا پرشاد۔ کنگال کا مقصد میں نے پالیا۔ ناانصافی کی تند آنکھ سے بہتے آنسوؤں کا سیلاب جس کی موجیں تشنہ کا دل چیر جاتی ہیں۔

منشی پریم چند۔ ٹھیک سمجھے آپ۔

ڈائرکٹر انبا پرشاد۔ معاف کیجئے! میں اس شاہکار کا پورا معاوضہ دینے سے معذور ہوں۔ صرف دس ہزار کی حقیر رقم پیش کرتا ہوں۔

منشی پریم چند۔ دس ہزار!

ڈائرکٹر انبا پرشاد۔ جی! ہاں، ہمارے غلام ملک میں اس سے زیادہ کی سکت نہیں۔ افسوس آپ اور میں یورپ میں نہ ہوئے ورنہ میں الگزنڈر کورڈا[1] کی طرح آپ کی قدر کرتا جس نے سولو کی "آنے والی اشیاء کی صورت" کا خاکہ ایک لاکھ میں خریدا۔ ... ہم مجھے آپ سے بڑی عقیدت ہے۔

منشی پریم چند۔ شکریہ۔

ڈائرکٹر انبا پرشاد۔ میں یہ دس نوٹ پیش کرتا ہوں۔

(آغا جان نوٹ لے لیتے ہیں۔ ڈائرکٹر انبا پرشاد چلا جاتا ہے)

منشی پریم چند۔ آغا جان! یہ رقم کافی ہے۔

آغا جان۔ یقیناً! میں نہ کہتا تھا کہ آج آپ زندہ ہو جائیے گا۔

منشی پریم چند۔ جی! ہاں۔ میں زندہ ہو لیا۔ اس رقم کی وقعت محمود[2] کی اشرفیوں سے زائد نہیں جو اس نے فردوسی کو تب بھیجیں، جب وہ دنیا سے رحلت کر گیا۔

---

[1] الگزنڈر کورڈا، گاموٹ فلم کمپنی کے تجربہ کار ڈائرکٹر ہیں۔ آپ کی مشہور فلمیں یہ ہیں: "ہنری ہشتم کی خفیہ زندگی"، "ڈان جون کی خفیہ زندگی" وغیرہ۔ آپ کی بیشتر فلمیں السٹر اور ہالی وڈ کے سالانہ انتخاب کی دس بہترین فلموں سے ہوا کرتی ہیں۔ [2] معاف کیجئے! میں نے اپنی ضرورت پوری کرنے کی خاطر تاریخی طور پر ایک غلط تلمیح پیش کی ہے۔

آغا جان ۔ نہیں، نہیں ۔ آپ ابھی زندہ ہیں ۔

منشی پریم چند ۔ گھبرائیے نہیں! میں فردوسی کی صف میں شریک ہونے کو ہوں ۔ مجھے کاغذ دیجئے !

آغا جان ۔ کیا یہ نوٹ؟

منشی پریم چند ۔ جی! نہیں ۔ سادہ کاغذ اور قلم ۔ نوٹ کی ضرورت میں ختم کر چکا ۔

آغا جان ۔ کیا آپ افسانہ لکھیئے گا؟

منشی پریم چند ۔ جی ہاں ۔ زندگی کے افسانے کا تکملہ

آغا جان ۔ یعنی؟

منشی پریم چند ۔ کاغذ اور قلم !

آغا جان ۔ آپ بیمار ہیں ۔

منشی پریم چند ۔ نہیں، میں تندرست ہوں ۔ کاغذ، قلم دیجئے !

آغا جان ۔ لیجئے! کاغذ، قلم ۔ اچھا ہوا آپ نے تندرستی کا نام لیا ۔

منشی پریم چند ۔ جائیے! ڈاکٹروں کو بلا لائیے ! کہئے کہ مریض تندرست ہو گیا !

آغا جان ۔ بہتر ۔

(آغا جان ڈاکٹروں کی طرف جاتے ہیں ۔ منشی جی کاغذ پر جلدی جلدی تحریر کرتے ہیں ۔ تھوڑے وقفے بعد آغا جان ڈاکٹروں اور نرسوں کے ہمراہ لوٹ آتے ہیں ۔ منشی جی اجل کے براق شانوں پر سوار ہو، اگلے جہان پہنچے ۔

۔ آہ! منشی پریم چند مرحوم! آخر تندرست ہو کر ہی دم لیا ۔ اب انہیں کوئی بیماری نہیں ۔ موت ہر بیماری کا حکمی علاج ہے ۔

(جھٹ منشی جی کی وصیت اٹھاتے اور پڑھتے ہیں ۔)

"پیارے آغا جان!

اب مجھے تھائیسس نہیں رہی، میں شفایاب ہوں ۔ سخت گیر انسانوں کی تلخی کا خاتمہ ہوا ۔ میں نے موت کا میٹھا گھونٹ پی لیا ہے ۔ رنج کی کوئی بات نہیں ۔

آپ جانتے ہیں کہ میں مزدور تھا ــــ صحافتی دنیا کا مزدور، میری مزدوری کئی ایک کے ذمے ہے ۔ اگر اب بھی میری مزدوری چکا دی جائے تو آپ فراہم کر لیں اور پریم چند فنڈ قائم کر لیں ۔ کنگال کا دس ہزار اس کا پہلا عطیہ ہے ۔ کل فنڈ سے میری مزدور برادری کی بہبود کا کام کیا جائے اور حزب العمال کا سنگِ بنیاد رکھا جائے ۔ دیکھیئے! مزدوروں کی تحریک مخلصانہ چلے !

پریم چند مرحوم"

آناً فاناً آنجہانی کے انتقال کی خبر ملک کے ہر گوشے میں پھیل گئی ۔ ادب کی دنیا نے خوب ماتم کیا، آنسو بہے، دل روئے لیکن وصیت؟ اس کی طرف کسی نے کان نہیں دھرا ۔ شاید وہ وصیت پھٹ بھی چکی ہو ۔

رحمٰن مذنب

غزل

ناکام ترے مُفت کا الزام نہ لیتے
دل کام کا ہوتا تو کوئی کام نہ لیتے؟

سَو مرتبہ جب تک کہ ترا نام نہ لیتے
اللہ ری حسرت کہ ہم آرام نہ لیتے

مانوس جو ہوتے خلش درد سے تم بھی
پھر دِل کے دُکھانے کا کبھی نام نہ لیتے

وہ تا بہ دل آئے تھے بڑی دُور سے چل کر
ماندے تھے بہت راہ کے آرام نہ لیتے

دُنیا ہی بدل دی تری برگشتہ نظر نے
کیونکر اثر گردشِ ایّام نہ لیتے

مرتے تھے غمِ دل پہ اُسی نے ہمیں مارا
جیتے تو پھر اِس غم کا کبھی نام نہ لیتے

پچھلے پہر اب ہار کے کہتے ہیں کہ اَے کاش
وعدہ ستم آرا سے سرِ شام نہ لیتے

کچھ ہم کو سمجھنا تھا کہ وعدہ ہے یہ کس کا
کچھ تم بھی تغافل سے بہت کام نہ لیتے

مجبور ہیں اس سے کہ صفا کیش ہیں وہ بھی
مَیں صِدق نہ ہوتا تو مرا نام نہ لیتے

صِدق جائسی

بچپن سے نوجوانی تک

غنچۂ نو مسکراتا پھولتا پھلتا ہُوا
دُودھ پی کر ماتا کی گود میں پلتا ہُوا

ہر مخاطب کی طرف بازو ہُمک کر کھولتا
پالنے میں لوریاں سُن سُن کے "آغوں" بولتا

پھول سے مُنہ میں انگوٹھا مطمئن انداز سے
اپنی ہستی پر بھروسا سطوتِ آغاز سے

صحن سے دالان میں پھرتا ہُوا گھٹنوں کے بل
فطرتِ آزاد میں نشو و نما گرمِ عمل

لے کے انگلی کا سہارا جھوم کر چلتا ہُوا
بچپنے کی چلبلی ٹکسال میں ڈھلتا ہُوا

ہر طرف چکّر لگانے میں شگوفے چھوڑتا
"چیز" کے لالچ میں الماری کے شیشے توڑتا

میز پر رکھی ہوئی اشیا میں ہلچل ڈالتا
خوبصورت جلد والی کاپیاں پر تالتا

کھو کے تصویروں کے منظر میں کتابیں پھاڑتا
اپنے کپڑوں پر دواتوں سے سیاہی جھاڑتا

مُدّعائے دل اشاروں میں ادا کرتا ہُوا
ٹوٹے پھوٹے بول صرفِ التجا کرتا ہُوا

پھول چُنتا، بیل کے اُلجھاؤ میں پھنستا ہُوا
باسبب روتا ہُوا، بامُدّعا ہنستا ہُوا

چھوٹی چھوٹی عمر والے دوستوں کے ساتھ ساتھ
بھاگتا ہے گیند کے پیچھے رکھے بلّے پہ ہاتھ

دیکھتے ہیں اب اسے جاتے ہوئے اسکول ہم
پا رہے ہیں سعیِ نیک انجام میں مشغول ہم

فارغ التحصیل ہو کر جب جوانی پائے گا
توڑ کر زنجیرِ محکومی رِہا ہو جائے گا

شاد عارفی

اصغر کی یادیں

اُسے بالکل بھول جاتا ہوں،
بھلا دیتا ہوں یکسر!
لیکن، پھر
وہ یک لخت یاد آجاتا ہے،
اچانک!

"

مرکر
وہ
کبھی کبھی
اس قدر زندہ ہو جاتا ہے
کہ پہلے کبھی اتنا نہ تھا!

"

تُو آیا اور چلا گیا،
اچھا ہوا میری جان!
کہ تُو آیا اور چلا گیا۔
ہنستا کھیلتا کودتا،
مسکراتا گنگناتا،
گاتا سُناتا
تُو آیا اور چلا گیا!
کیا ہوا اگر تُو آیا اور جلد چلا گیا،
تیری ایک جھلک میں لاکھ جلوے تھے اصغر!

"

اچھا ہوا کہ تُو پیدا ہوا
اور ہم نے خوشیاں منائیں،
اچھا ہوا کہ تُو
ہماری اندھیری دُنیا پر
ایک چاند بن کر چمکا،
رات کی رات!
اچھا ہوا کہ تُو آیا
تُو نے ہمیں ہنسایا
اور پھر
ہمیں روتا چھوڑ کر
تُو چل دیا!

"

"میرا دل تو یہی چاہتا تھا کہ میں یہیں رہوں،
میں ٹھہروں اِس کے لئے اُس کے لئے ہر ایک کے لئے،
مگر مجھے تو
میرے دوستو! بُلاوا آگیا،
سو میں چل دیا!
مجھے جانا تھا۔
میں کھیلا بھی بہت پڑھا بھی بہت،
میں نے زندگی میں کچھ کام بھی کئے، اور راگنیاں سُنیں ہزار ہا،
لیکن پھر مجھے بُلاوا آگیا کہ چل اور سُن سب سے میٹھی راگنی!"

""

لہریں

(اصغر بشیر کے مُسکرا کر خاموش ہو جانے کی ایک توجیہ)

شعریتِ خوابیدہ تھی موجِ ہوا کے سانس میں
مے کا ہلکا سا تبسّم تھا فضا کے سانس میں

جھُومتے تاروں کی نظریں بیخودی انگیز تھیں
ہلکی ہلکی ظلمتیں اِک خواب نغمہ ریز تھیں

زندگی پروہ بہ پردہ نغمۂ خاموش تھی!
آسماں کی نیلگوں وسعت سراپا گوش تھی

رات کاروماں پرور دَور تھا مصروفِ کار
آنکھ جھپکاتا اُڑا پھرتا تھا نیندوں کا غبار

بج رہا تھا رات کے گاتے ہوئے سایوں کا ساز
حکمراں تھی وقت پر ظلمات کی زُلفِ دراز

کر رہے تھے گفتگو خاموشیوں سے شب کے راز
ساز خوابیدہ تھا لیکن جاگتی تھی رُوحِ ساز

کارواں سرگوشیوں کا کر رہا تھا طے سفر
لا رہی تھی عالمِ اسرار سے مستی خبر

فطرتِ بیدار کے سینے کی دھڑکن تیز تھی
ساحلِ دریا کی مٹّی زیست سے لبریز تھی

ڈھونڈتی تھی فطرت اپنے اِک سہانے رُوپ کو
اپنی گُم گشتہ جوانی کی سُنہری دُھوپ کو

ناگہاں دریا کے سینے سے تلاطُم سا اُٹھا
فطرتِ غمگیں کے مہماں کا سفینہ آگیا

دیکھ کر اصغرکی چمکیلی نگاہوں کی شراب
فطرتِ تشنہ دہن خود بن گئی اِک موجِ آب

کھول کر آغوش پھر اِک مُلتجی انداز سے
کچھ کہا فطرت نے اپنے نوجواں ہمراز سے

مُسکرا کر اصغرِ شبنم جبیں آگے بڑھا
لہر بن کر لہر کے آغوش میں گُم ہوگیا

موت تازہ زندگی کا رُوح پرور ساز ہے
دو حسیں لہروں کے مِل جانے کی اِک آواز ہے

عدم

کہانی

نزہت اور رُوحی،
بجھے ہوئے نقش، جن کی تابانی کو شاعر کا تصوّر
زندہ نہ کر سکے۔

نئی چاہت کا ارمان

جوانی کے واپس نہ آنے والے دن گزرتے گئے
آس پاس خوش نما چہرے دیکھنے سے آنکھوں
میں رونق رہی،
دل میں ہلکی ہلکی لرزشیں،
ایک آدھ لغزش بھی؛
رُوح کی گہرائیوں میں مَوت کی اُداسی چھائی رہی۔

کانتا ——
صنوبر کے جنگل میں آوارہ، برفانی ہواؤں کا
ایک جھونکا؛
پھولوں کو نم دینے والی شبنم کی تازگی اور ٹھنڈک
لئے ہوئے،
اور ہمالہ کی شاداب وادیوں میں اُبھرنے والے
سُورج کی پہلی کرن کی خوشگوار تمازت بھی؛

اُس کی مسکراہٹ، کائنات کا شفقِ صبح کی
لطافتیں جلوٗ میں لئے نیند سے جاگ اُٹھنا ہے؛
سنجیدہ، اور شوخ بھی،
باتوں میں موہنی انداز میں تمکنت بھی؛
ذوقِ گناہ سے ناآشنا،
ستی ہو جانے والی ہند و عورتوں کی مانند معصوم
اور جاوداں محبّت، خدمت اور قربانی کے خواب دیکھنے والی!
اپنے ذہن و کردار کی ساری طاقتیں دنیا کو خوبصورت
بنانے میں صرف کر دینے کی تمنّا لئے ہوئے؛
اور اُس کی نگاہ میں فضا کی وسعتوں کے حل
نہ ہونے والے راز کی جھلک ——

میری ہستی کی تکمیل ہوتی جاتی ہے!
اور بات بات میں شرما جانے سے کانتا اپنے
دل کی بات کہہ گئی ہے۔

ہمیں ایک دوسرے سے محروم رہنا ہے،
اِس لئے کہ ہمارے بزرگوں نے دو مختلف
مذہبوں میں جنم لیا!

"ابنِ مریم"

دھوکا

میں نے اک تصویر بنائی نیچے لکھا نام کسی کا ——— سلمیٰ

سلمیٰ شرم و حیا کی دیوی پیکر اک اخلاص و وفا کا ——— سلمیٰ

جانے کب چپکے سے سلمیٰ آگئی سب کی آنکھ بچا کر ——— اندر

سب چیزوں سے ہاتھ اُٹھا کر اپنی اس تصویر کی کرلی ——— چوری

سلمیٰ خوب رہا یہ دھوکا تم نے تو اک چیز چرائی ——— نقلی

اصل ہے دل کے آئینے پر کاغذ پر تھی نقل اُتاری ——— یونہی

اس کو نہیں چوری کا کھٹکا ہمت ہے تو اُس کو چراؤ ——— آؤ!

صادق قریشی ایم۔اے

محفلِ ادب

ترقی پسند ادیبوں کی تین نظمیں

علی جواد زیدی

یہ کاہے کا سوچ ہے تجھ کو یہ کاہے کی جھنپتا ہے ساگر تٹ پر بیٹھا بیٹھا کیوں تو لہریں گنتا ہے

یاد نہ کر وہ دن اے ساتھی، جو دن پہلے بیت گئے لُوٹ کے ہم دُکھیاروں کو جب لونجی والے جیت گئے

کل کی بات بھلا دے دل سے کل کی بات کہانی ہے دریا جو کل تک سُوکھا تھا آج وہی طُوفانی ہے

مسّر بھون کے باہر آجا اب چُپ رہنا مُشکل ہے کام کی منزل آگئی آگے، یہ ہمت کی منزل ہے

دیکھ وہ اُٹھی کالی آندھی دُنیا میں اِک ہلچل ہے خُون ہُوا ہے اتنا سستا جیسے برساتی جل ہے

وہ لہرایا لال پھریرا جیسے مست شرابی ہو دھیمے دھیمے ہوا نے گایا سرمائے کی خرابی ہو

مخدوم محی الدین

ترے ہمرہی کھو گئے رے مسافر مسافر چلے چل

نہ جانے وہ کیا ہو گئے رے مسافر مسافر چلے چل

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر

چلے چل، چلے چل، چلے چل، چلے چل

اندھیرے میں اب ساتھ کیا دیکھتا ہے دیا بجھ گیا ہے

بہر حال چل رات کیا دیکھتا ہے دیا بجھ گیا ہے

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر

چلے چل، چلے چل، چلے چل، چلے چل

سمجھ موت کی وادیوں سے گزرتا چلا جا رہا ہے
سحر کے تعاقب میں گرتا اُبھرتا چلا جا رہا ہے
مسافر
چلے چل، چلے چل، چلے چل، چلے چل

سلام مچھلی شہری

مئی کے مہینے کا مانوس منظر
غریبوں کے ساتھی یہ کنکر یہ پتھر
وہاں، شہر سے ایک ہی میل ہٹ کر ——— سڑک بن رہی ہے!

زمیں پر کدالوں کو برسا رہے ہیں
پسینے پسینے ہوئے جا رہے ہیں
مگر اس مشقت میں بھی گا رہے ہیں ——— سڑک بن رہی ہے!

مصیبت ہے، کوئی مسرت نہیں ہے
انہیں سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہے
جمعدار کو کچھ شکایت نہیں ہے ——— سڑک بن رہی ہے!

جواں۔ نوجواں اور خمیدہ کمر بھی
فسردہ جبیں بھی، بہشتِ نظر بھی
وہیں شامِ غم بھی، جمالِ سحر بھی ——— سڑک بن رہی ہے!

جمعدار سائے میں بیٹھا ہوا ہے
کسی پر اُسے کچھ عتاب آ گیا ہے
کسی کی طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے ——— سڑک بن رہی ہے!

یہ بے باک اُلفت - یہ الھڑ اشارا
بسنتی سے رامو تو رامو سے رادھا
جمعدار بھی ہے بسنتی کا شیدا ——— سڑک بن رہی ہے!

اگر سر پہ پگڑی تو ہاتھوں میں ہنٹر
چلا ہے جمعدار کس شان سے گھر
بستی بھی جاتی ہے پوشیدہ ہو کر ——— سڑک بن رہی ہے!
سمجھتے ہیں لیکن ہیں مسرور اب بھی
اسی طرح گاتے ہیں مزدور اب بھی
بہرحال واں حسبِ دستور اب بھی ——— سڑک بن رہی ہے!

"نیا ادب"

دیہاتی بولیاں

آیئے آپ کو پنجاب کے دیہاتوں کی سیر کرائیں یہ ہندوستان کے وہ دیہات ہیں جہاں رواں تہذیب و تمدن کے بوجھ سے بالکل آزاد ہے۔ جہاں جذبات بچوں کی مانند کھیلتے ہیں۔ یہاں کا عشق ایسا سونا ہے جس میں مٹی ملی ہوئی ہے تصنع اور بناوٹ سے پاک ان دیہاتوں میں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ قدم قدم پر آپ کو شاعری نظر آئے گی جو اوزان کی قید اور لفظی بندشوں سے بالکل آزاد ہے۔

یہاں کی کھلی ہوا میں آپ چلیں پھریں گے تو آپ اپنے اندر ایک نئی زندگی پائیں گے۔ آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ بھی عشق کر سکتے ہیں، آپ کے اندر بھی پھیل کر والہانہ وسعت اختیار کر لینے کی قوت موجود ہے، آپ بھی پرندوں کی زبان سمجھ سکتے ہیں اور ہواؤں کی گنگناہٹ آپ کے لئے بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔ جب ابابیلیں خاموش آسمان میں ڈبکیاں لگاتی ہیں اور شام کو چمگادڑیں قطار اندر قطار جنگلوں کی طرف تیرتی ہیں اور گاؤں واپس آنے والے ڈھور ڈنگروں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگرو بجتے ہیں اور فضا پر ایک نرالی نلاح کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو آپ کا دل بھی کبھی پھیلے گا اور کبھی سکڑے گا۔

وہ دیکھئے سامنے کچے کوٹھے زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے اُپلوں کی قطار دور تک چلی گئی ہے۔ مٹی کے یہ گھروندے بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں کیونکہ ان میں فاصلہ نہیں۔ ایک کوٹھا دوسرے کوٹھے سے ہمکنار ہے، اسی طرح اس کھلے میدان پر ایک اور کھلا میدان بن گیا ہے۔ ان کوٹھوں پر چارپائیاں اوندھی پڑی ہیں۔ گنے کے لمبے لمبے چھلکے جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے دھوپ اتنی تیز ہے کہ چیل بھی انڈا چھوڑ دے۔ فضا ایک خوابگوں اداسی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی کسی چیل کی باریک چیخ ابھرتی ہے اور خاموشی پر ایک خراش سی پیدا کرتی ہوئی ڈوب جاتی ہے۔۔۔۔

مگر اس تیز دھوپ میں یہ کوٹھے پر کون چڑھا ہے۔۔۔۔ ارے یہ تو کوئی اس گاؤں کی مٹیار (نوجوان لڑکی) ہے۔ دیکھو تو کس انداز سے تپے ہوئے کوٹھے پر ننگے پیر چل رہی ہے۔ یہ لو وہ کھڑی ہو گئی۔ اسے کس کا انتظار ہے۔ اُس کی آنکھیں کیسے ڈھونڈ رہی ہیں۔ ببولوں کے جھنڈ میں یہ کیا دیکھ رہی ہے۔ کب تک یہ ایسے کھڑی رہے گی۔ کیا اس کے پیر نہیں جلتے۔ شاید اسی نے یہ کہا ہوگا۔

کوٹھے اُپر کھلیاں میری سڑ گیاں پیر دیاں تلیاں
میرا یار نظر نہ آوے

(ترجمہ) میں کوٹھے پر کھڑی ہوں اور یوں کھڑے کھڑے بھرے پیر کے تلوے جل گئے ہیں — لیکن میرا عاشق نظر نہیں آتا)۔

نہیں اس نے تو گنّے کے سُوکھے ہوئے چھلکے اکٹھے کرنے شروع کر دیئے ہیں... لیکن یہ پھر بار بار اُدھر کیوں دیکھتی ہے جدھر بوڑھے برگد کے سائے تلے ایک نوجوان ہاتھ میں ایک لمبی لاٹھی لئے کھڑا ہے.......... اس کی لاٹھی پر پیتل کے کوکے کتنے چمک رہے ہیں!

ہم ادھر نوجوان کی طرف دیکھتے رہے اور اُدھر آخری کوٹھے پر جو کہ یہاں سے کافی دور ہے ایک اور نوجوان لڑکی نمودار ہو گئی۔ دُور سے کچھ دکھائی تو نہیں دیتا مگر اُس کی ناک کی لونگ کتنی چمک رہی ہے۔ کیا اسی لونگ کے بارے میں یہ کہا گیا تھا۔

تیرے لونگ دا پیا لشکارا ہالیاں نے ہل ڈک لئے

(ترجمہ: تیری لونگ (ناک کی کیل) نے جب چمک پیدا کی تو ہل چلانے والوں نے اپنے ہل روک لئے (اس خیال سے کہ بجلی چمکی ہے اور بارش آ رہی ہے۔)

ابھی نہیں یہ تو کچھ اور ہی معاملہ ہے.... یہ دیکھئے، ادھر کی لڑکی اُس لڑکی کو اشارہ کر رہی ہے۔ شاید اُسے آنے کے لئے کہہ رہی ہے پھر اُس طرف بھی جھک کر دیکھتی ہے جہاں گاؤں کا وہ نوجوان آدمی سائے تلے کھڑا ہے۔ ایک ہاتھ سے لاٹھی پکڑے ہے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے گلے میں پڑے ہوئے تعویذوں سے کھیل رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ 'بولی' یاد آ جاتی ہے جو اس گاؤں کے تمام لڑکوں کو یاد ہے۔ کیا ہے؟.... ہاں....

مُنڈا موہ لیا تویتاں والا دمڑی دا سک مل کے

(ترجمہ: ایک تگڑے جوان کو جس نے آفات سے محفوظ رہنے کے لئے تعویذ پہن رکھے تھے ایک لڑکی نے دمڑی کا سک (اخروٹ یا کسی اور درخت کی چھال جس سے ہونٹ رنگے جاتے ہیں) مل کر موہ لیا۔)

پھر اشارے ہو رہے ہیں۔ اِدھر کی لڑکی اُسے جلدی آنے کے لئے اشارہ کر رہی ہے.... صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی ہے۔

کوٹھے کوٹھے آ کچھئے تینوں بنتو دا یار وکھاواں

(ترجمہ:۔ کوٹھے کوٹھے چلی آ کچھی.... مَیں تجھے بنتو کا عاشق دکھاؤں)

کیا پتہ ہے کہ یہ نوجوان جو برگد کے سائے تلے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے بنتو ہی کا عاشق ہو۔ بنتو کا نہ ہوگا تو کسی اور کا ہوگا۔ کیونکہ بہرحال اسے کسی کا تو عاشق ہونا ہی چاہئے۔ دیکھئے کس انداز سے کھڑا ہے۔ سر پر سفید کھادی کا صافہ باندھ رکھا ہے اور اپنے آپ کو کس قدر اہم سمجھ رہا ہے۔ اس کو دو جوان لڑکیوں نے اس حالت میں دیکھ لیا ہے اب سارے گاؤں کی کنواریوں کو معلوم ہو جائے گا کہ سر پر سفید کھادی کا صافہ باندھ کر وہ برگد کے سائے تلے کھڑا تھا۔ کیا کیا باتیں نہ ہوں گی۔ پھبتیاں اُڑائی جائیں گی اور کنوئیں پر دیر تک ہنسی اور قہقہوں کے چھینٹے اُڑتے رہیں گے۔ اور کیا پتہ ہے کہ کوئی شریر چھوکری اُونچے سُر میں یہ گانا شروع کر دے۔

سر بنھ کے کھدر دا صافا چندرا شوقین ہو گیا

(ترجمہ:۔ سر پر کھادی کا صافہ باندھ کر بے چارہ شوقین ہو گیا ہے۔)

یہ چھوکری جب ہنسے گی تو اُس کے دانتوں میں جڑی ہوئی سونے کی کیلیں بھی ہنسیں گی اور کیا پتہ ہے کہ وہاں پاس ہی کسی جھاڑی کے پیچھے کوئی شریر لونڈا چھپا بیٹھا ہو۔ وہ یہ ہنستی ہوئی کیلیں دیکھ لے اور اُٹھ کر جب کھیتوں کا رُخ کرے تو دفعتہً اُس کے ہونٹ وا ہوں اور یہ بولی پرندے کی طرح پھُر سے اُڑ جائے۔

مُرج سُنیارا لے گیا　　　　جنہیں لائیاں دنداں وچ میکھاں

(ترجمہ:۔ مزا تو وہ سنیارا لے گیا جس نے تمہارے دانتوں میں یہ کیلیں جڑیں۔)

یہ لڑکا جب کھیتوں سے لوٹ کر گاؤں آئے گا اور شام کو چوپال پر حقّے کے دَور چلیں گے تو وہاں وہ سفید صافے والا بھی ہوگا۔ اس کو معلوم ہو جائے گا کہ کنوئیں پر پانی بھرنے کے دوران میں کس ظالمانہ طریق پر اُس کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے تو وہ افسردہ اور مغموم ہو جائے گا، اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اُس کو اپنی معشوقہ کی بے رُخی ستاتی رہے گی، ایک آہ کی صورت میں آخر کار اس کے سینے میں یہ الفاظ اُٹھیں گے:۔

کلا ٹکریں تا حال سناواں　　　　دُکھاں وِچ پئے گئی جندڑی

(ترجمہ:۔ اس میں اپنے کسی دوست کو یا اپنے ہی آپ کو مخاطب کیا گیا ہے، اگر تم مجھے اکیلے میں ملو تو میں تمہیں سارا حال سناؤں، میری زندگی دُکھوں سے گھِر گئی ہے۔)

بہت ممکن ہے وہ اپنے کسی دوست کو ہمدرد جان کر حالِ دل کہے اور یوں اپنے دل کا غبار ہلکا کرے مگر اتفاق ایسا ہو کہ اُن دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے اور جس کو اُس نے اپنا ہمدرد بنایا تھا اُسے سارے گاؤں میں نشر کر دے۔ اس پر یہ کوئی ضرور کہے گا:۔

یاری وِچ نہ وکیل بنائیے　　　　لڑ کے دس دؤ گا

(ترجمہ:۔ عشق میں کسی کو وکیل نہ بنانا چاہیے۔ کیونکہ اگر اُس سے لڑائی ہو گئی تو وہ سارا بھید کھول دے گا۔)

پھر نامراد عاشق یہ سمجھ کر کہ اُس کا عشق ناکام رہا ہے ہل چلاتے ہوئے دوپہر کی اُداس دُھوپ میں یکایک بول اُٹھے گا:۔

میری لگ دی کسے نہ دیکھی　　　　تے ٹُٹدی نوں جگ جاندا

(ترجمہ:۔ جب میری اور اُس کی محبت ہوئی تو کسی کو پتا تک نہ چلا مگر اب کہ یہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے ساری دُنیا کو معلوم ہو گیا ہے اور جگ ہنسائی کا باعث ہوا ہے)

لیکن کیا پتہ ہے کہ دوسری طرف اُس کی معشوقہ کو بھی کچھ کہنا ہو۔ کیا پتہ ہے کہ وہ اُس سے محبت کرتی ہو اور ظاہر نہ کر سکتی ہو، کیونکہ یہ بول اُس کے مُنہ سے بغیر کسی وجہ کے تو نہیں نکلیں گے۔

یار سی سرو دا بوٹا　　　　ویہڑے وِچ لا رکھدی

(ترجمہ:۔ میرا یار کیا تھا سرو کا درخت تھا۔ کاش اُسے اپنے صحن میں لگا رکھتی)

اتنے میں فوج کی بھرتی شروع ہو جائے گی اور اُس کا یہ سرو قد یار اس پر چلا جائے گا۔ اُس کی دُنیا سُونی ہو جائے گی۔ جب برسات آئے گی، پیپل کے درختوں میں جھولے پڑیں گے، آم کے درختوں پر پپیہے پیہو پیہو پکاریں گے۔ کوئلیں کوکیں گی۔ سارا گاؤں خوش ہو گا تو وہ ...... وہ اپنے گھر کی گیلی منڈیر کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھ کر پکارے گی۔

بول وے نمانیاں کاواں   کولاں کوک دیاں

(ترجمہ:۔ اے نمانے کوّے تو بھی بول، کوئلیں کوک رہی ہیں۔ کوّا اگر بولے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی عزیز آنے والا ہے۔)

میدان خالی ہونے پر اس کا گاؤں میں ایک اور عاشق بھی پیدا ہو جائے گا۔ وہ ہر روز اس اُمید پر اُس کے گھر کے پاس سے گزرا کرے گا کہ ایک روز وہ اُسے ضرور بُلائے گی اور اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہوں گی مگر ایسا نہیں ہوتا۔ آخر کار وہ تنگ آکر کہے گا:۔

کدی چندریئے ہاک نہ ماری   چُوڑے والی بانہہ کڈھ کے

(ترجمہ:۔ لفظ چندری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اُردو میں اس کے لئے کوئی مترادف لفظ مجھے نہیں ملا۔ چندری پنجابی زبان میں مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے کبھی ہمدردی کے طور پر اس کو گفتگو میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں محبت اور شکایت دونوں اس میں حل ہیں۔ وہ اس کو چندری سے مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تُو نے کبھی اپنے چُوڑے (ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چوڑیوں کا ایک مجموعہ جو کلائی سے لے کر کہنی تک دیہات کی عورتیں پہنتی ہیں) والا بازو باہر نکال کر مجھے اشارہ نہیں کیا، مجھے اپنے پاس نہیں بُلایا۔)

ایک زمانہ گزر جائے گا۔ عشق کی داستان فسانہ بن جائے گی اور آخر ایک روز یہ دیہاتی حسینہ کسی کے ساتھ بیاہ دی جائے گی۔ اس کے بیاہ پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونگی۔ لوگ اُس کا اور اُس کے خاوند کا مقابلہ کریں گے اور کوئی نوجوان چیخ اُٹھے گا:۔

مُنڈا روہی دی کِکّر دا جاتو   ویاہ کے لے گیا چندر ورگی

(ترجمہ:۔ "روہی دی کِکّر" ایک خاص قسم کے ببول کو کہتے ہیں جس کی لکڑی بڑی کرخت اور کالی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مرد جو کہ روہی کے ببول کی طرح کھردرا اور کالا تھا چاند جیسی دُلہن بیاہ کر لے گیا ہے !!)

پہلی رات آئے گی۔ ہزاروں کپکپاہٹیں اپنے ساتھ لئے ...... خیر اس قصّے کو چھوڑیئے۔ یہ مرحلہ کسی نہ کسی طرح طے ہو ہی جائے گا اور دُلہن پُرانی ہو جائے گی، پھر جھگڑے شروع ہوں گے اور ایک روز اُس کا خاوند اُس کے پہلے عاشق کو بُرا بھلا کہے گا تو وہ اُس وقت سینے پر پتھر رکھ کر خاموش تو ہو جائے گی۔ مگر اکیلے میں اس کے مُنہ سے یہ بول نکلیں گے :۔

میرے یار نُوں مندا نہ بولیں   میری بھاویں گُت پُٹ لئیں

(ترجمہ:۔ تم میری چُٹیا جڑ سے اُکھیڑ لو، مگر میرے یار کو بُرا بھلا نہ کہو۔)

اور ...... اور پھر ...... یونہی عمر بیت جائے گی اور یہ فسانہ اُس دیہات میں نئے فسانے پیدا کرے گا۔

(سعادت حسن منٹو)

مرزا غالب کے چند غیر مطبوعہ اشعار

میرزا غالب ہزار اپنے دیوان کو "دیوانِ بے رنگ" کہا کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو شہرت اور مقبولیت دیوانِ اُردو نے حاصل کی فارسی کو نصیب نہیں۔ ابھی حال ہی میں دیوانِ غالب کے دو قدیم مطبوعہ نسخے ہماری نظر سے گذرے ایک مفید خلائق آگرہ میں ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا اور دوسرا دہلی سے ۱۸۶۱ء میں۔ ممکن ہے اس سے پہلے بھی شائع ہو چکے ہوں۔ اس مدت سے آج تک بیسیوں اڈیشن شائع ہوئے جس میں وہ اڈیشن بھی شامل ہے جو سڑے گلے کاغذ پر ۲ر کی قیمت کو ملتا تھا اور مطبوعہ جرمنی اور مرقعِ چغتائی بھی جس کی قیمت سینکڑوں روپے تھی، ایک مدت کے بعد نسخۂ حمیدیہ بھی شائع ہوا جس میں مرزا کے وہ اشعار بھی ہیں جو کسی متداول نسخے میں نہیں ملتے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اشعار مندرجہ دیوان کے علاوہ ان کے اور اشعار نہیں ہیں۔ اگر تفحص اور تلاش جاری رکھی جائے تو اب بھی سینکڑوں اشعار مل سکتے ہیں۔

ہم ناظرین کی ضیافت کے لئے ایک نادر الوجود مخطوطہ "عمدۃ المنتخبہ" مرتبہ سرور سے مرزا کے بعض اشعار درج کرتے ہیں۔ جو دیوان کے کسی نسخے میں نہیں۔

اعظم الدولہ سرور دہلی کے عمائدین سے تھے تذکرہ سرور ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں لکھنا شروع کیا اور ۱۲۲۶ھ یا ۱۲۲۷ھ میں تمام کیا۔ لیکن اس کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ اضافے کرتے رہے، ورنہ غالب کا ذکر اس میں نہ ملتا کہ غالب کا سالِ ولادت ۱۲۱۲ھ ہے اور ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۲۶ھ میں وہ ۴ یا زیادہ سے زیادہ ۱۴ برس کے ہوں گے۔ اس مختصر سی عمر میں ان کی شاعری نے اس قدر ترقی نہ کی ہو گی کہ سرور جیسا شخص ان کے بارے میں "در فنِ سخن سنجی تتبعِ محاوراتِ میرزا بیدل بعد ریختہ محاورات فارسی موزوں می کند بالجملہ موجدِ طرز خود است" اور "رو بہ خیال بندی بیش از بیش نہادِ خاطر دارد" لکھتے۔

دوسری بات یہ کہ غالب کے سرور کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔ جیسا کہ خود سرور کے الفاظ "و با راقم رابطہ یک جہتی مستحکم دارد" سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ بالکل بعید ہے کہ اعظم الدولہ سرور ایک ۱۴ برس کے بچے کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات رکھتے۔

"پنج آہنگ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور غالب سے ملنے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا اور احمد بیگ تپاں مقیم کلکتہ کا حال اور کلام بھی ان کو تذکرے کے لئے دیا تھا۔ غالب کا حال اور کلام تو تذکرۂ سرور میں درج ہے لیکن معلوم نہیں کہ تپاں کا حال کیوں نہ درج ہو سکا۔

عمدۃ المنتخبہ ایک نادر اور کمیاب تذکرہ ہے۔ یورپ میں اس کے بہت کم نسخے نظر آتے ہیں۔ ہمیں ہندوستان کے قابلِ فخر محقق جناب قاضی عبدالودود صاحب بی۔ اے کینٹب بیرسٹر کا ممنون ہونا چاہیے جو وہاں سے بعض نادر تذکروں کی نقلیں یا اقتباسات لائے ہیں جو اُردو ادب کی تاریخ میں سنگِ بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

اب ذیل میں تذکرۂ سرور سے غالب کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

"اسد اللہ خاں اسد المعروف مرزا نوشہ اصلش از سمرقند، مولدش اکبرآباد، جوان قابل یار باش، درد مند، ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ، ذوقِ ریختہ گوئی در خاطر تمکن غمہائے عشقِ مجاز تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز، دریں سخن سنجی تتبعِ محاوراتِ مرزا بیدل بعد ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجدِ طرزِ خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش در زمینِ سنگلاخ مضامین موزوں کردہ، رو بہ خیال بندی بیش از بیش۔ بیش نہادِ خاطر دارد"

اب اشعار ملاحظہ ہوں۔ ترتیبِ اشعار مرتب کی ہے صاحبِ تذکرہ کی نہیں:-

جگر سے ٹوٹے ہوئے مو کی رہے انساں پیدا	دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

نیازِ عشق خرمن سوز اسبابِ ہوس بہتر | جو ہو جائے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

محفلِ شمعِ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

ہوئے ہے جادہ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں

سر گراں مجھ سے سبک روکے نہ رہنے سے ہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صبا جاتا ہوں

دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

شمشیرِ صافِ یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہے کہ برخسارِ سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

دیکھ وہ برقِ تبسم بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے

کھول کر دروازۂ مے خانہ بولا مے فروش
اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسدؔ
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

"تذکرۂ سراپا سخن" مصنفہ سید محسن علی محسن لکھنوی میں بھی مرزا غالب کا ایک شعر ملتا ہے جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں۔ اس تذکرہ کا سالِ تکمیل ۱۲۶۹ھ ہے۔ مرزا کے حال میں یہ دو سطریں لکھی ہیں:-

"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ ولد عبد اللہ بیگ خاں قوم ترک اولاد میں گشتاسپ کے، مولد اکبر آباد، مسکن دہلی
دیوانِ فارسی اور ریختہ اور پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے، مشاہیر شعرائے دہلی ہیں"

اور اس کے بعد نمونۂ کلام میں یہ غزل درج کی ہے:-

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

دیوان کے متداول نسخوں میں یہ غزل ۹ شعر کی ہے، اس میں ۹ اشعار ہیں۔ فاضل شعر یہ ہے ؎

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں

مختار الدین آرزو

"ایشیا"

مطبوعات

سلطان محمد قلی قطب شاہ از ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ۔ یہ کتاب دکن کے خاندانِ قطب شاہیہ کے پانچویں حکمران سلطان محمد قلی کے حالاتِ زندگی اور سیاسی و ادبی کارناموں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ سلطان محمد قلی کو تاریخِ ادبِ اُردو میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ (ہمارے موجودہ معلومات کی روشنی میں) وہ اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر مانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین زورؔ نے زیادہ تر سلطان کی زندگی کے سوانحی اور سیاسی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے لیکن آخر میں دو باب اس کی اُردو اور فارسی شاعری کے متعلق بھی لکھے ہیں۔ سلطان محمد قلی کو ہماری تاریخ و ادب میں جو خاص حیثیت حاصل ہے اس کے پیشِ نظر ڈاکٹر زورؔ کی یہ تازہ تصنیف یقیناً بہت دلچسپی اور قدر سے دیکھی جائے گی۔ کتاب پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اُنیس عکسی تصویریں بھی شامل ہیں۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتا:۔ سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدر آباد دکن۔

سُریلے بول:۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی چند نظموں نے اُردو ادب میں اُن کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ اُن کی نظمیں اُردو ادب میں بالکل ایک نئی چیز ہیں۔ یہ نظمیں ایک مغربی تعلیم یافتہ ادیب کی "ہندی روح" کے دلآویز نغمے ہیں۔ عظمت اللہ خاں کی نظمیں اُن کی زندگی میں مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ اُن کے بعد آنکھیں ان نظموں کے لئے ترس گئی تھیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ محترمہ عظمت زبیدہ بیگم صاحبہ نے اب ان نظموں کو یکجا کر کے ایک خوبصورت مجموعے کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ تقریباً ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے اور شاعر کی تصویر سے مزین ہے۔ ڈاکٹر محی الدین زورؔ قادری نے دیباچہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی محمد ریاض الدین صاحب نے عظمت اللہ خاں کے حالاتِ زندگی بھی بہت خوش اسلوبی سے بیان کئے ہیں۔ ہماری رائے میں اُردو کا کوئی کتب خانہ اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ جو شخص عظمت اللہ کی شاعری سے آشنا نہیں وہ اُردو شاعری کے ایک اہم باب سے بے خبر ہے۔ قیمت ۲؎ پتہ:۔ محمد رشید اللہ خاں صاحب۔ برکت بنگلو۔ اولڈ ٹھگی جیل حیدر آباد دکن۔

گلبانگِ حیات:۔ یہ حضرت امینِ حزیںؔ کے کلامِ نظم کا مجموعہ ہے جس کے ساتھ سر عبدالقادر کے قلم سے ایک تمہید بھی شامل ہے۔ حضرت امینِ حزیںؔ پنجاب کے کہنہ مشق اور نامور شعرا میں سے ہیں اور ان کے کلام کا اس طرح یکجا ہو کر میسر آنا باعثِ مسرت ہے۔ اس مجموعۂ کلام کا انتساب علامہ اقبالؒ کی یاد سے کیا گیا ہے اور یہ بجا بھی ہے کیونکہ حضرت امینِ حزیںؔ شعرا کی اُس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جن کا کلام ایک خاص پیغام کا حامل ہوتا ہے۔ شاعری امینِ حزیںؔ کے نزدیک محض فنونِ لطیفہ کی ایک صنف نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کو بہتر اور بلند تر بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ غزلیں اور نظمیں سبھی اس مجموعۂ سخن میں موجود ہیں اور سب میں اسی پیغامی رنگ کی شان ہے۔ بعض شعر ہمیں بے حد پسند آئے مثلاً یہ دو شعر ؎

دردِ دل اصل میں تھا ولولۂ جوششِ نمو	جس سے یہ دانۂ ناچیز شجر ہو کے رہا
عشق میں جوشِ عبودیتِ دل دب نہ سکا	کہیں آنسو، کہیں نالہ، کہیں ہُو ہو کے رہا

کتاب کی ضخامت دو سو صفحے سے زائد اور قیمت دو روپے ہے۔ اربابِ ذوق اُردو اکیڈیمی پنجاب، لوہاری دروازہ لاہور سے طلب فرمائیں۔

انجمن ترقی اُردو کی کہانی:۔ یہ چھوٹا سا رسالہ ۴؍ کی قیمت پر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے شائع کیا ہے۔ مصنف مولوی غلام ربّانی صاحب ہیں جنہوں نے جناب مولوی عبدالحق صاحب کی بست و پنج سالہ معتمدی انجمن ترقی اُردو کی داستان دلچسپ انداز سے سلیس اُردو میں سُنائی ہے۔

ادب اور سیاست

کا خوشگوار امتزاج دیکھنا ہو تو "نوائے وقت" ملاحظہ فرمائیے۔

"نوائے وقت" اردو زبان کا واحد ادبی و سیاسی اخبار ہے جو خواجہ شبر حسن اور ڈاکٹر محمد باقر کی ادارت میں لاہور سے انتہائی پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس اخبار کا مقصد تجارت نہیں۔ بلکہ یہ ایک خاص مشن اور نصب العین کے ماتحت جاری کیا گیا ہے

چند خصوصیتیں

۱۔ علامہ اقبال کے پیغام اور کلام کی اہمیت سے متعلق مستقل سلسلہ مضامین

۲۔ ڈاکٹر محمد باقر ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اردو سبھا

۳۔ نظری سیاست Political Theory پر پرمغز اور مفید مضمون

۴۔ علمی سیاسیات پر بے باک مگر متین تبصرہ

۵۔ غریب شہر کا سنجیدہ مزاح اور لطیف طنز

سر عبد القادر۔ خواجہ غلام السیدین۔ میاں بشیر احمد۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ حمید نظامی۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ مسٹر ہادی حسین آئی۔ سی۔ ایس (سابق ایڈیٹر ہزار داستان) پروفیسر یوسف سلیم شیخ انوار الحق آئی۔ سی۔ ایس۔ حضرت احسان دانش۔ میراجی حفیظ ہوشیارپوری اس اخبار کے مستقل قلمی معاونوں میں شامل ہیں۔

سالانہ چندہ صرف دو روپے۔ طلبہ۔ لائبریریوں اور اردو کی انجمنوں سے ڈیڑھ روپیہ

نمونہ کے لئے پانچ پیسے کے ٹکٹ روانہ فرمائیے۔ مفت نہیں بھیجا جائے گا۔

مینیجر
اخبار "نوائے وقت" لاہور

طالب بنارسی کی نظموں کی ضرورت

جن حضرات کے پاس اردو کے پرانے رسالوں کے فائل موجود ہیں۔ وہ منشی ونائک پرشاد صاحب طالب بنارسی کی نظمیں ان فائلوں سے نقل کروا کر مجھے بھجوا سکیں۔ تو میری بے حد امداد فرما سکتے ہیں۔ جو حضرات ایسے فائلوں سے نقل کروا کر یا اس کے علاوہ طالب صاحب کا کوئی کلام مجھے مندرجہ ذیل پتہ پر بھجوا سکیں۔ میں ان کی بے حد ممنون احسان ہوں گی۔ میں یہ بھی چاہتی ہوں۔ کہ مرحوم کے ایسے عزیزوں کے مجھے پتے مل جاویں۔ جن سے طالب صاحب کا کلام مل سکتا ہو۔ جو حضرات ایسے پتے بھیج سکتے ہوں۔ وہ بھی مجھے بہت مشکور فرماویں گے

سلیمہ بیگم ہنرت ملک محمد اسلم خاں صاحب

ایم۔ اے (کیمبرج) بیرسٹر ایٹ لاء کوٹھی "الفیض"۔ ۶ لٹن روڈ، لاہور

خیالات کی پریشانی اور پراگندگی آپ کی تنزلی کی وجہ ہو جائے گی

یہ پریشانی اور پراگندگی دل و دماغ میں اور معدہ میں حرارت کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اکثر خوراک چائے، بیڑی سگریٹ، پان، تمباکو وغیرہ زیادہ استعمال کرنے سے خون میں تپش پیدا ہو کر آتشیں مادہ پیدا ہو جاتا ہے، اور حرارت زیادہ ہو کر قبض پیدا کر دیتی ہے جس سے دل و دماغ زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں آپ اپنی حفاظت کے لئے صحت افزا روح پرور جڑی بوٹیوں کے مرکب سے تیار شدہ امرت بار نواولیہ کا استعمال کریں۔ امرت بار نواولیہ دل و دماغ اور معدہ کو طراوت بخشتا ہے امرت بار نواولیہ خیالات کی پراگندگی، اعضا جسم کا ڈھیلا پن اور چہرے کی بے رونقی قوت حافظہ کی کمی کاہلی وغیرہ کو دور کر کے حیرت انگیز فرحت اور رونق عطا کرتا ہے۔ امرت بار نواولیہ جسم سے گرمی کی زیادتی کو دور کر کے آتشیں مادہ دور کر دیتا ہے۔ امرت بار نواولیہ خون بکثرت پیدا کر کے جسم کو مضبوط بنا دیتا ہے۔ ایک مرتبہ آزمائش کر کے اطمینان حاصل کریں۔

قیمت فی ڈبیہ ۲۰ تولہ عہ دو روپے ــــ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ آتنک نگرہ فارمیسی جام نگر (کاٹھیاواڑ)

Saleema Begum —

امریکن سائنسدانوں نے آبِ حیات ڈھونڈھ نکالا!
سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ
موڈرن سائنس کا معجزہ
ہرمون اور وٹامن دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہ کر سکی۔ لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی۔ کا شکرگذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے انتہائی جدوجہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا ایلکلائڈ دریافت کیا ہے جو انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکشوئل سائنس انسٹی ٹیوٹ اوف برلن امریکہ اور یوروپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جس سے شاندار اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔
اس جادو اثر آب حیات کا نام اوٹون "Otone" ہے جسے سلور ڈراپ (SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے۔
اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دلخوش کن تبدیلی محسوس کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غائب ہو جائیں گی۔ بدن کی جلد پر شباب کی تروتازگی اور ملائمیت آجائیگی۔ رخسارے گوشت و خون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دہکنے لگیں گے چہرہ پر حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہوجائیگی۔ اور آپ اپنی اصلی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پینتالیس سال کے ہیں تو پچیس سال کے معلوم ہوں گے
اوٹون کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا حکمی علاج ہیں۔
خون کی کمی۔ دماغی و جسمانی کمزوری۔ سر کا چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا۔ چڑچڑاپن۔ دل کی دھڑکن۔ بے تکا موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا جلد خشک جلنا۔ دائمی قبض۔ سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہوجانا یا گرنا۔ کمر کا درد . . . . ضعف اعضائے رئیسہ۔ ضعف گردہ و مثانہ۔ عورتوں کی پرسوت کی بیماری۔ ہسٹریا (لیکوریا) سیلان الرحم۔ اور دیگر رحمی شکایتوں کو آناً فاناً دور کر دیتے ہیں۔
اوٹون کی آب حیات تاثیرات کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں۔ اور ایک فوٹو بنوائیں ایک ہفتہ استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز تاثیرات کا اندازہ ہوگا۔
اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے۔ بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔
15,000 روپیہ کا نقد انعام
اوٹون ریسرچ لیبارٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کردے کہ اوٹون کی آب حیات تاثیرات کسی حیواتی ہرمون یا وٹامن کی موجودگی کا باعث ہیں تو ہم اسے مبلغ ... ۱۵ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔
اوٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں بارہ روپیہ ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہندوستان میں رائج کرنے کے لئے اس کی قیمت کچھ مدت کے لئے تین روپیہ آٹھ آنہ رکھی ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اوٹون لیبارٹری کب اس کی قیمت میں اضافہ کردے۔
Otone
The Elixir of Life
IN SILVER DROPS
An Ideal and Unique Preparation for Rejuvination
سول ڈسٹری بیوٹرز
میسرز گرانڈ فارمیسی (ایچ۔ پی) پوسٹ بکس ۲۳۲۳ کلکتہ
تار کا پتہ۔ "اوٹون" کلکتہ۔ ٹیلیفون۔ بڑا بازار ۵۳۰۰
Sole Distributor
GRAND PHARMACY(H. P.)
POST BOX 2323 · CALCUTTA

قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں ۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے ۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱ر کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے ۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے ۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا ۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے ۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر ۔

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے ۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے ۔

منیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

The Title Page and Pictures Printed at Half-Tone Press,
Ram Nagar, Dev Samaj Road, Lahore.